FIRST BOOK IN URDU ON DOOMSDAY 2012

21 دسمبر 2012ء

دُنیا قیامت کے دہانے پر

تحقیق و تصنیف

صاحبزادہ محمد عبدالرشید بھٹی

ایک ایسی کتاب جو آپ کی سوچ بدل دے!

A BAB-UL-ILM RESEARCH FOUNDATION BOOK

MANCHESTER BARCELONA LAHORE ISLAMABAD M.B.DIN

(BIRF--Always A Step Ahead)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

فہرست

نمبر	ابواب	صفحہ
1۔	تعارف	1
2۔	کائنات کا انجام اور مذہبی نظریات	8
3۔	اسلام اور تصورِ قیامت	12
4۔	سائنس اور قربِ قیامت	31
5۔	نظامِ شمسی میں ایک ''نامعلوم وجود''	33
6۔	زمین کی کہکشانی قطار بندی	38
7۔	ویب باٹ کمپیوٹر پروگرام اور 21 دسمبر 2012ء	42
8۔	قدیم تہذیبوں میں تصورِ قیامت اور وقت کا خاتمہ	47
9۔	میکسیکو کی مایا تہذیب	50
10۔	سومیری تہذیب اور 21 دسمبر 2012ء	53
11۔	قدیم کہانت میں وقتِ قیامت کا تعین	62
12۔	قیامت، جمعتہ المبارک اور 21 دسمبر 2012ء	71
13۔	تصورِ مہدی، دجال اور قربِ قیامت	75
14۔	نزولِ مسیحؑ اور فتنۂ دجال	87
15۔	یاجوج ماجوج اور دجال	94
16۔	Bibliography	102

(All Rights Reserved)

تعارف

INTRODUCTION

عصر حاضر کا انسان مادی ترقی کی اُس انتہا پر پہنچ چکا ہے، جس کی مثال انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہواؤں میں اُڑنا کبھی انسان کا خواب ہوا کرتا تھا۔ جو آج نہ صرف حقیقت کا روپ دھار چکا ہے، بلکہ روزمرہ زندگی کا عام سا معاملہ لگتا ہے۔ اسی طرح دنوں اور مہینوں کے سفر کو سمیٹ کر گھنٹوں میں طے کر لینا، زمینی جغرافیہ سکیڑ کر ایک عالمگیر تہذیب کا قیام عمل میں لے آنا، سمندروں کے نیچے ریل کے راستے بنا دینا[1]، سمندری اور برفانی شہر آباد کر دینا، کشش ثقل کے خول کو پھاڑ کر زمینی مدار سے باہر نکل جانا، خلاؤں کو دور تک مسخر کر لینا اور سطح چاند پر انسانی عظمت و ترقی کا نشان انسانی قدموں کے نشانات کی صورت میں چھوڑ آنا عہد جدید کے وہ معجزات ہیں، جو ماضی کے توہم پرست انسان کے ادراک کی آخری حدوں سے بھی ماوراء ہیں۔ اگر آج سائرس اعظم، سکندر اعظم، قسطنطین اعظم، چنگیز خان، امیر تیمور، سلطان سلیمان قانونی، اکبر اعظم اور نپولین بونا پارٹ جیسے عہد ساز فرمانرواؤں میں سے کوئی ایک بھی اکیسویں صدی کے سائنسی اور تکنیکی دور کی ایک جھلک بھی دیکھ لے تو شائد ورطۂ حیرت میں گم ہو کر اسے کوئی مافوق الفطرت دنیا سمجھ بیٹھے۔ ماضی کا انسان اگر انسانی ترقی کے بیان میں مبالغہ آرائی کی آخری حدوں کو چھونے لگتا تو بھی شائد اُس کا شعور موجودہ ترقی کے عشر عشیر تک نہ پہنچ پاتا۔

انسان کی مادی ترقی کا اِس نقطۂ عروج پر پہنچ جانا بلاشبہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ تاہم اِس کارنامے کے پیچھے تصورات، نظریات، فلسفوں اور کاوشوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جس نے انسانی عقل کو ترقی کے زینہ پر درجہ بدرجہ چڑھنے میں مدد دی اور انسان کا عی شعور ہر انفرادی فکر و فلسفہ کے پیش کیے جانے کے بعد وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ انسان نے غاروں سے نکل کر گھر اور بستیاں بنانا سیکھ لیا۔ وہ کھانا جمع کرنے والا جانور (Food Gatherer) تھا، لیکن فطرت نے اسے کاشتکاری کا ہنر سکھا دیا اور یوں انسان نے علم و

1۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان چلنے والی ریل گاڑی ''یوروسٹار'' (Euro Star) تقریباً چھپن (56) کلومیٹر کا فاصلہ زیرآب بنائی گئی سرنگ میں طے کرتی ہے۔ یہ سرنگ جدید طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ سمندر کے اس حصے کو ''انگلش چینل'' (English Channel) کہتے ہیں۔

آ گہی کے اُس سفر کا آغاز کیا، جس کی انتہا شاید قیامت سے پہلے کبھی نہ ہو۔ تاہم یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ترقی میں آگے کی سمت اٹھنے والے ہر انسانی قدم نے انسان کی سعی فکر پر ایک منفی اثر بھی ڈالا۔ تازہ ذہن رکھنے اور قدرتی ماحول کے قریب رہنے والا انسان آسائش و آرائش کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ الجھاؤ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اس نے قدرتی ماحول سے دوری اختیار کر کے خود کو مصنوعی ماحول کے سانچے میں ڈھال لیا۔ یہی وہ نقطہ تھا، جہاں سے مصنوعی معاشرتی نظام کا آغاز ہوا اور انسان نے اس کو جدید زبان میں تہذیب (Civilization) کا نام دیا۔ اور یوں تہذیبی زندگی کا آغاز آج سے لگ بھگ چھ ہزار (6000) سال قبل قدیم عراق (Mesopotamia) کے ''زرخیز ہلال'' (Fertile Crescent) نامی خطہ میں ہوا۔ جو اپنے ارتقاء کی مختلف صورتوں سے ہوتا ہوا آج ''سکائی سکریپرز'' (Sky-Scrapers) اور ''سپیس سائنس'' (Space Science) کے عہد میں داخل ہو چکا ہے۔

اکیسویں صدی میں دنیا کے ہر سوچ و بچار کرنے والے انسان کے سامنے ایک مختصر مگر انتہائی پیچیدہ سوال ہے کہ آخر انسانی ترقی کی انتہا کیا ہوگی؟ ابھی انسان کو اور کتنا آگے جانا ہے؟ اور کائنات کے وہ کون کون سے راز ہیں، جو ابھی افشا ہونے باقی ہیں؟ کیا اس خودکار مادی نظام (Self-Governing Material Mechanism) کی کوئی انتہا بھی ہے؟ اگر آج کی تیز رفتار زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے انسان ان بنیادوں پر سوچنا شروع کر دے تو یوں محسوس ہوگا کہ دنیا کا نظام بغیر رُکے ہمیشہ یونہی چلتا رہے گا۔ یہ ایک ایسا پُرفریب فلسفہ ہے، جس سے قدیم یونان سے لے کر دورِ جدید تک کا ہر فلسفی متاثر نظر آتا ہے۔ اُنیسویں صدی کے عظیم فلسفی کارل مارکس نے بھی اس مسئلہ سے مدلل بحث کرنے کی کوشش کی اور بالآخر "Dialectical Materialism" کی صورت میں یہی نتیجہ نکالا کہ کائنات میں مادے کا وجود ہمیشہ سے ہے اور یہ کبھی فنا نہیں ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں مادے کے وجود اور انسان کی مادی ترقی نے کارل مارکس کو ایک ایسے فریب کا شکار کر دیا، جس نے بعد کی دنیا کو بھی بہت عرصہ تک اپنے سحر میں لیے رکھا۔ تاہم جو بنیادی نکتہ یہاں قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی جبلت میں مادے کی فطرت کو سمجھنے کی خواہش ہر دور میں رہی ہے۔

علم الانسانیات (Anthropology) کے مطابق انسانی معاشرے کے ارتقاء کے دوران دو ایسے شاندار انقلابات وقوع پذیر ہو چکے ہیں، جن کی بدولت آج کا انسان اس قابل ہوا کہ آفاق تک کی تسخیر

کر لے۔ زراعت کی ابتداء کو تاریخ انسانی کے اوّلین ''انقلابِ عظیم''[1] کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ وہ حیرت انگیز واقعہ تھا، جس نے انسان کے طرزِ زندگی کو یکسر بدل ڈالا اور انسان نے ''Socialization'' کے عمل کا آغاز کر کے خود کو ''بے قاعدہ'' سے ''با قاعدہ'' بنالیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہی وہ واقعہ ہے، جسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں نے انسان کو Homo Sapien Sapien یعنی ''عقلمند و دانا انسان'' کا وسیع ترین معنی رکھنے والا نام دیا۔ انسانی تاریخ کا دوسرا انقلابِ عظیم اٹھارہویں صدی عیسوی میں وقوع پذیر ہوا اور اسے ہم ''صنعتی انقلاب'' (Industrial Revolution) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس واقعہ کی نسبت صرف اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ انسان نے صنعتی انقلاب کی بدولت Superstitious سے Scientific عہد میں قدم رکھا۔ اس عمل کو جدید اسلوب میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان نے Survival کی مشقتوں سے نکل کر Living کی پرتعیش زندگی کا آغاز کر دیا۔ صنعتی انقلاب کے بپا ہونے کے بعد انسانی معاشرہ میں عالمگیر سطح پر بنیادی تبدیلیاں (Radical Changes) رونما ہوئیں اور انسان کو اپنے وجود سے لے کر اپنی معاشرت اور تہذیب تک کے مفہوم کی وضاحت از سرِ نو کرنا پڑی۔ معاشرہ جوں جوں پھیلتا گیا، پیچیدگیاں بڑھتی گئیں، کرۂ ارض کی آبادی جو کہ بیسویں صدی کے آغاز پر ایک ارب تھی، محض ایک صدی میں چھ ارب سے تجاوز کر گئی۔ تاریخِ بنی نوع انسان میں آبادی میں اضافہ کی یہ رفتار کبھی نہیں دیکھی گئی۔ ایک سائنسی تجزیہ کے مطابق اگر آبادی میں اضافہ کی یہ شرح برقرار رہی اور انسان کو وہ تمام سہولیات میسر رہیں، جو آج اُسے حاصل ہیں، تو 2400ء کے اختتام پر دنیا میں موجود ہر انسان کو ایک مربع فٹ سے زیادہ جگہ دستیاب نہیں ہوگی، اور اتنی جگہ محض اُس کے کھڑے ہونے کیلئے ہی کافی ہوگی[2]۔

سولہویں صدی عیسوی میں جب مغربی یورپ میں ''احیائے علوم'' (Renaissance) کا انقلاب بپا ہوا تو انسان نے بہت سارے ایسے سوالات اٹھائے، جن کا تعلق بیک وقت Micro-Cosmos اور Macro-Cosmos سے تھا۔ چونکہ علمی ترقی اور قدرتی سائنس ابھی نوزائیدہ

1۔ انگریزی زبان میں انسانی تاریخ کے اوّلین زرعی انقلاب کو "Neolithic Revolution" کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح ماہرینِ عمرانیات (Sociologists) اور ماہرینِ انسانیات (Anthropologists) کے ہاں کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔

2۔ وضاحت کیلئے دیکھئے۔

Asimov, Isaac, *Asimov's Guide to Science*, New York: Basic Books, 1972, "Introduction"

تھے۔اس لیے اِن سوالات کا تسلی بخش جواب کبھی نہ دیا جا سکا۔ یہاں یہ امر انتہائی دلچسپی کا حامل ہے کہ لگ بھگ وہی سوالات آج کے اذہان میں بھی موجود ہیں اور انسان اپنے سعی علم کو اکٹھا کر کے آج بھی اُن سوالات کا جواب ڈھونڈنے میں سرگرداں ہے۔ تاہم سولھویں صدی کے انسان اور آج کے انسان کی کاوشوں میں یہ فرق ہے کہ سولھویں صدی میں تجرباتی علم ابھی نوخیز تھا، جبکہ اکیسویں صدی میں یہ اپنی پختہ تجرباتی (Empirical) شکل اختیار کر چکا ہے۔ جس کی بدولت جدید زمانے کا انسان کائنات کے بہت سے ایسے رموز واسرار سے پردہ اٹھا چکا ہے، جو کبھی مافوق الفطرت قوتیں سمجھے جاتے تھے۔

دنیا کا خاتمہ جسے ہم عرفِ عام میں ''قیامت'' سے تعبیر کرتے ہیں، بھی ایسے چند انتہائی مشکل سوالات میں سے ایک ہے، جن پر آ کر انسانی دماغ بے بس ہو جاتا ہے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتا۔ تاہم ایک حقیقت جو آج باہیں کھولے ہمارے سامنے کھڑی ہے اور جس کے رونما ہونے سے انکار تقریباً ''ناممکن'' ہے، وہ قیامت کا آنے والے چند ہی سالوں میں وقوع پذیر ہونا ہے۔ بلاشبہ ہم قیامت کے انتہائی قریب کھڑے ہیں۔ قیامت کے ادراک کے حوالے سے جو تجسس کی لہر عصر حاضر کے انسان میں پیدا ہوئی ہے وہ نہ صرف قابل غور ہے، بلکہ قابل ستائش بھی ہے۔ انسان نے آج کے دور میں میسر قدیم و جدید علوم کی مختلف جہتوں کو کھنگال کر جو منطقی و سائنسی نتائج حاصل کیے ہیں وہ انتہائی حیران کن ہیں۔ تاہم انسان کو جہاں اپنی دریافت پر فخر اور خوشی ہے، وہیں یہ نتائج اُس کیلئے انتہائی پریشان کن بھی ہیں۔ کیونکہ ان نتائج کے ذریعے مستقبل کے کچھ ایسے راز افشاء ہو چکے ہیں، جن کا ادراک دن کے چین اور راتوں کی نیند اُڑا دینے کیلئے کافی ہے۔ جوں جوں انسان کی تحقیق آگے بڑھ رہی ہے، مستقبل قریب کے ایک خاص دن پر تمام تحقیقی اور سائنسی مکاتب فکر کی توجہ مرکوز ہوتی جا رہی ہے۔ واقعات کی بے تحاشہ دُھند میں یہ خاص دن کچھ انفرادی خصوصیات کی بنا پر واضح تر اور اہم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ہر علمی اور فکری حلقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ جب کچھ 'خاص دلائل' کی روشنی میں کچھ 'خاص زاویوں' پر رونما ہونے والے کچھ 'خاص واقعات' کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں تو وہ بھی بالکل وہی نتائج اخذ کرتے ہیں، جو ہم اِس کتاب میں پیش کرنے جا رہے ہیں۔

Apocalypse یعنی ''ظہورِ قیامت'' کے حوالے سے آج تک ہونے والی تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ 21 دسمبر 2012ء ایک ایسا دن ہوگا، جو دنیا میں ڈرامائی تبدیلیوں اور تباہی کے ایک عظیم

سلسلے کی ابتداء کرے گا۔ یہ سلسلہ کب اور کیسے ختم ہوگا؟--اِس بارے میں ہم ابھی کوئی حتمی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ تاہم آخری عہدِ انسانی کی ابتداء کے حوالے سے جو معلومات ہمیں آج تک دستیاب ہو چکی ہیں، اُن کی روشنی میں ہم یہ بات سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قیامت کا دن ہمارے بے حد قریب آن پہنچا ہے۔

21 دسمبر 2012ء کی تاریخ پر بطورِ ابتداءِ قیامت اصرار کرنے کی بے شمار وجوہات ہیں۔ اس امر کی وکالت کے لیے ایسے بہت سارے قرائن موجود ہیں، جن کو ہم سائنسی زبان میں ''ثبوت'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ تمام ثبوت جن کو ہم اِس کتاب میں پیش کرینگے اسی ایک خاص تاریخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قارئین آنے والے صفحات میں اُن تمام معلومات سے آگاہ ہوں گے، جو 21 دسمبر 2012ء کو قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے قرائن کے متعلق ہیں۔ چونکہ جدید اسالیبِ تحقیق میں کثیر الجہتی تحقیق کو زیادہ قابل اعتماد مانا جاتا ہے، اس لیے ہم جونہی اِس کسوٹی پر 21 دسمبر 2012ء کے بارے میں دستیاب تمام معلومات کا جائزہ لیتے ہیں تو خطرے کی سرخ گھنٹی زور زور سے بجتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

''اُن لوگوں کا حساب قریب آن پہنچا ہے اور (افسوس) وہ غفلت میں پڑے منہ پھیر رہے ہیں۔''

(سورۃ الانبیاء، ۲۱:۱)

21 دسمبر 2012ء پر ارتکاز کرتے ہوئے جو تحقیقات عالمگیر سطح پر کی جا رہی ہیں، اُن کو "Millenarianism 2012" کہا جاتا ہے۔ ان تحقیقات کی بدولت انسان پر حقائق کے ایسے نئے باب کھل رہے ہیں، جن کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مثال کے طور پر مغرب کی تیز زندگی میں انسان تقریباً بھول ہی چکا تھا کہ مادے سے تخلیق شدہ ہماری دنیا کی کوئی انتہا بھی ہے۔ مادیت پرستی پر مبنی مغربی فلسفۂ زندگی نے انسان کو کئی صدیاں پہلے ہی مذہب سے مکمل طور پر بیزار کر دیا تھا۔ انسان زندگی اور اس کے وجود کے معانی و مدعا کو سمجھنا تو درکنار، ان کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک مغربی اذہان میں ایک سنسنی سی سرایت کر گئی۔ 1980ء کی دہائی میں اُٹھنے والی ایک پراسرار آواز روز بروز بلند تر ہوتی گئی۔ یہ آواز بیک وقت دو سمتوں سے آ رہی تھی۔ ایک طرف سے سائنسدان کہہ رہے تھے کہ کرۂ ارض پر انسانی وجود محض چند سالوں کا مہمان ہے۔ اور دوسری طرف زمانہ قدیم کی کہانیوں اور تہذیبوں کے اندر صدیوں سے مقید آوازیں چیخ چیخ کر خبردار کرنے لگیں کہ اکیسویں صدی کا آغاز

درحقیقت حیاتِ انسانی کا اختتام ہے۔اس وقت جہاں ان دونوں تنبیہات نے سنسنی پھیلا رکھی ہے، وہیں مذہبی پیشگوئیوں اور وعیدوں نے بھی یہ خبر دے کر جدید انسان کے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہیں کہ آج کا انسان آخری زمانے میں جی رہا ہے اور اس عہد کے خاتمہ پر پھر سے وہی کیفیت چھا جائیگی، جسے ہم ''عالم عدم'' کے نام سے جانتے ہیں۔

''زمین پر جو کچھ ہے، سب فنا ہونے والا ہے۔صرف تیرے ربّ کی ذات، جو عظمت اور عزت والی ہے، باقی رہ جائیگی۔''

(سورۃ الرحمٰن، ۲۷-۲۶:۵۵)

ان Apocalyptic معاملات میں جدید انسان کی دلچسپی اس قدر بلند ہوئی کہ ایک نیا مکتبۂ فکر وجود میں آ گیا۔ یہ مکتب بہت سے ایسے ''ماہرینِ آثارِ قیامت'' پر مشتمل ہے جو یونیورسٹیز اور انٹر کھٹکی ریسرچ انسٹیٹیوٹس کی سطح پر محض اس بات کی تحقیق کر رہا ہے کہ کون کون سے ایسے (مذہبی، تاریخی، سائنسی اور اساطیری) ثبوت موجود ہیں، جو قربِ قیامت کا پتہ دے رہے ہیں۔

راقم الحروف کی طرف سے پیش کردہ یہ کتاب بھی ایسی ہی تحقیق پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ اُردو زبان میں اس منفرد لیکن انتہائی توجہ طلب موضوع پر یہ پہلی کتاب ہوگی، جو کہ قارئین کو پیش کی جا رہی ہے۔اس کتاب کی تحریر و طباعت کا مقصد ہرگز قیامت کی ہولناکیوں کا خوف پیدا کرنا نہیں۔ بلکہ اُردو زبان کے قارئین کو ایسے موضوعات پر ہونے والی اُن تحقیقات سے متعارف کروانا ہے، جنہوں نے عالمی سطح پر بھونچال بپا کر رکھا ہے۔راقم الحروف نے کتاب کی تحریر سے پہلے 21 دسمبر 2012ء کی بطور ''یوم قیامت'' نشاندہی کے موضوع پر ہر پہلو سے غور کیا، تا کہ اس بات کا قطعی ادراک کیا جا سکے کہ کہیں یہ ایک بھونڈا مذاق تو نہیں، جسے عالمی میڈیا محض بے چینی پیدا کرنے کیلئے پھیلا رہا ہو۔تاہم دورانِ تحقیق جب راقم الحروف کو ایسے ٹھوس شواہد میسر آئے جن کا جھٹلایا جانا تقریباً ناممکن تھا، تو راقم الحروف نے کچھ ضروری چھان بین کے بعد قلم اٹھا کر اس موضوع کو عوامی بنانے کا فیصلہ کر لیا۔راقم الحروف ٹھوس شواہد و دلائل کی روشنی میں خود بھی اس بات کا قائل ہے کہ 21 دسمبر 2012ء انسان کی ئی زمینی زندگی کا اہم ترین دن ہوگا۔عین ممکن ہے کہ انسانی وجود اور سیارۂ زمین دونوں ہی اس دن انجام سے دوچار ہو جائیں۔اگر ایسا نہ ہوا تو اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ انسان کی تخلیق کردہ مادی تہذیب دھڑام سے گر جائے اور انسانی آبادی بھوک و

افلاس کا شکار ہو کر بالآخر ختم ہو جائے۔معروف سائنسدان ''البرٹ آئن سٹائن''(Albert Einstein) نے ایٹم بم کی ایجاد کے بعد ایک مشہور بات کی تھی۔جس کا سیاق سباق اگرچہ مختلف ہے۔تاہم یہ ہمارے ''بھوک وافلاس'' والے نکتے پر بڑی حد تک استدلال کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔آئن سٹائن نے کہا تھا:

"I know not with what weapons World War III will be fought, but World War IV will (if ever) be fought with sticks and stones."

21 دسمبر 2012ء کا دن بہت سے حوالوں سے اہم سمجھا جا رہا ہے۔اگرچہ ماضی میں بھی قیامت کے جلد ظہور کی پیشگوئیاں ہوتی رہیں۔لیکن وہ سب جھوٹ ثابت ہوئیں۔تاہم آج قطعی انکار کی گنجائش نہیں۔اپنے اس مؤقف کی حمایت میں راقم الحروف صرف اتنا کہنا چاہے گا کہ 21 دسمبر 2012ء کے قطعی استرداد سے پہلے ضروری ہے کہ کم از کم اُن شواہد کا ایک نظر جائزہ لے لیا جائے، جو قیامت کی ابتدا کے ضمن میں پیش کیے جا رہے ہیں۔21 دسمبر 2012ء کا دن سائنسی، تاریخی اور مذہبی نقطہ ہائے نظر سے بے انتہا اہمیت اختیار کر چکا ہے، حتیٰ کہ اسلام جیسا سائنسی و منطقی دین بھی اس دن کی بطور یومِ قیامت حمایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔الغرض ہر طرف سے بے شمار ٹھوس ثبوت دستیاب ہو چکے ہیں۔ان ثبوتوں کی روشنی میں ایک اور بات طے ہو جاتی ہے کہ قیامت کے اکیسویں صدی میں ظہور کا تصور ہر دور میں ہمہ گیر تصور کے طور پر رائج رہا اور آج بھی یہ ایک ہمہ گیر اور عالمگیر تصور کے طور پر اُبھرا ہے، جس کو جھٹلانے کیلئے ہمیں مخالفانہ ٹھوس شواہد کی ایک لمبی فہرست اور بہت سا وقت درکار ہو گا۔ بلاشبہ یہ دونوں ہی اب دستیاب نہیں۔کیونکہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

قارئین سے التماس ہے کہ وہ کتاب میں پیش کردہ شواہد کا بغور جائزہ لیں اور سنجیدگی سے اِن کی نوعیت پر غور و خوض کریں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب کسی قاری کی زندگی میں بنیادی تبدیلی کا باعث بن جائے۔

کائنات کا انجام اور مذہبی نظریات

End of Universe & Religious Ideology

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قیامت کا پورا تصور ہی اپنی اصلی شکل میں مذہب کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ کرۂ ارض پر موجود تمام مذاہب کائنات کے انجام کی مختلف تشریحات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے ہر معروف مذہب کے اندر کائنات کی تخلیق، نظم ونسق، مقاصد اور انجام کے حوالے سے چند عقائد اور کہانیاں پائی جاتی ہیں۔ ان سب عقائد اور کہانیوں میں جو چیز مشترک ہے وہ انسان کی اس سارے نظام میں اہمیت اور اُس کا کلیدی کردار ہے۔ ہر مذہب انسان کو کائنات میں مرکزی کردار عطا کرتا ہے اور اُسے عالم رنگ وبو میں مافوق الفطرت قوتوں کا نمائندہ قرار دیتا ہے۔

انسان آج جس طرز کے تصورِ قیامت سے واقف ہے اس کی تخلیق قدیم عراق (Mesopotamia) کی ''سومیری تہذیب'' (Sumerian Civilization) میں لگ بھگ 3000 قبل مسیح میں ہوئی۔ اسی تصور کو عراق کی سرزمین پر سومیریوں کے بعد آباد ہونے والی ''عکادی قوم'' (Akkadians) نے اپنایا اور باقی دنیا تک اپنے تہذیبی اثرات کے پھیلاؤ کے ذریعے پہنچا دیا۔ عکادیوں کے افکار کے سب سے زیادہ اثرات آلِ یعقوب ''بنی اسرائیل'' پر پڑے جو جغرافیائی اعتبار سے عراقی سرزمین کے بہت قریب موجودہ فلسطین میں آباد تھے۔ بنی اسرائیل کا قومی مذہب جس کو آج ہم ''یہودیت'' (Judaism) کے نام سے جانتے ہیں وہ پہلا الہامی مکتبہ فکر ہے جس نے تصورِ قیامت پر کسی حد تک تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہودی مذہبی کتب ''تنخ'' (Tanakh) اور ''تالمود'' (Talmud) دونوں ہی تصورِ قیامت کی مختلف جہتوں پر بحث کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہودیت کے بعد جس مذہب نے بڑے کھلے انداز میں قیامت کے موضوع پر بحث کی وہ ''عیسائیت'' تھا۔ عیسائیت بنیادی طور پر ایک اخلاقی اور روحانی مذہب ہے، جس کی دینیاتی فکر کا مطلق دارومدار ''اُخروی اجر'' (Salvation) اور ''اُخروی زمانہ میں مسیحا کی واپسی'' (Second Coming of Christ in End Times) کے نظریات پر ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک قیامت کا واقع ہونا ان دونوں معاملات سے منسلک ہے۔ عیسائی ''عہد نامہ جدید'' (New Testament) میں بکھرے ہوئے بکثرت حوالوں کے علاوہ جو کتاب خالصتاً اُخروی زمانہ اور قیامت کے

موضوعات کو زیرِ بحث لاتی ہے ،وہ یوحنا حواری کی ''کتابِ مکاشفہ'' (John's Book of Revelation) ہے۔اس کتاب کی خاصیت اس کا اسلوب اور عجیب وغریب تمثیلات ہیں جن کو پڑھ کر انسان انہونے خوف کا شکار ہو جاتا ہے۔کتابِ مکاشفہ میں حضرت عیسیٰؑ کی دنیا میں واپسی کی ایک ڈرامائی تصویر دی گئی ہے، جو حقیقت سے زیادہ افسانوی اور مافوق الفطرت لگتی ہے۔مرقوم ہے کہ:

"And I saw heaven opened, and behold a white horse: and he that sat upon him was called Faithful and True, and in righteousness he doth judge and make war. His eyes were as a flame of fire...and out of his mouth goeth a sharp sword, that with it he should smite the nations: and he shall rule them with a rod of iron." (Revelation 19:11-15)

ترجمہ:''اور میں نے آسمان کو پھٹتے ہوئے دیکھا۔اور دیکھو ایک سفید گھوڑا نکلا اور اُس پر جو سوار ہے وہ باوفا اور سچا کہلایا،اور اُس نے حق کے ساتھ (لوگوں کی) آزمائش کی اور جنگ کرتا گیا۔اُس کی آنکھیں آگ کے انگارے کی طرح تھیں۔اور اُس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی تھی جس سے وہ (کافر) قوموں کو سزا دے گا،اور وہ آہنی ہاتھوں کے ساتھ اُن پر حکومت کرے گا۔''

تیسرا عالمگیر مذہب جو قیامت جیسے مابعد الطبیعاتی موضوع کو کُریدتا اور اس پر تبصرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے،وہ اسلام ہے۔اسلام تصورِ قیامت پیش کرتے ہوئے اپنے پیشروؤں یعنی یہودیت اور عیسائیت سے بہت مختلف اندازِ بیاں اگرچہ نہیں اپناتا۔تاہم اسلام کا تصورِ قیامت کے حوالے سے مزاج دوسروں کی نسبت زیادہ منطقی اور سائنسی ہے۔اسلامی تعلیمات میں قیامت کے موضوع پر جو ''ٹائم فریم'' (Time-frame) دیا گیا ہے،اُسے بحیثیتِ مجموعی تین طرح کی عالمگیر نوعیت کی ''علامات''(Signs) سے جوڑ دیا گیا ہے۔ان علامات کو دینیاتی اصطلاح میں ''علاماتِ صغریٰ،علاماتِ کبریٰ اور علاماتِ بعیدہ'' کے نام دیئے جاتے ہیں۔احادیثِ نبویؐ سے یہ بات ثابت ہے کہ جونہی یہ علامات پوری ہو جائیں گی،قیامت بھی واقع ہو جائے گی۔

ان تین سامی الہامی مذاہب کے علاوہ زرتشت مت ،ہندو مت، بدھ مت، جین مت اور

کنفیوشس مت میں بھی دنیا و مافیہا کی بساط لپیٹ دیئے جانے کے مختلف عقائد پائے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر ہندومت ایک ایسا مذہب ہے جس کی مذہبی کتب میں تخلیق کائنات سے لے کر مطلق تباہی تک کے تمام واقعات موجود ہیں۔ ہندو دیوتاؤں میں اگر کوئی تخلیق کرنے والا ''براہما''(Brahma)اور قائم رکھنے والا ''وشنو''(Vishnu) ہیں،تو ساتھ ہی ایک تباہ کرنے والا دیوتا ''شیوا''(Shiva) بھی ہے جس کا کام ہی کائنات کو حتمی تباہی سے دوچار کرنا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت کا عقیدہ ہے کہ جونہی وشنو دیوتا کا دسواں ''اوتار''(Avatar)اور اُن کا آخری گھڑسوار مسیحا ''کلکی''(Kalki)ظاہر ہوجائے گا ،تو پھر ہندومت کے عالمگیر غلبے کے بعد دنیا اپنے اختتام کی طرف بڑھ جائے گی[1]۔عیسائیوں کا کتابِ مکاشفہ میں پیش کردہ حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کا منظر اس ہندو عقیدہ سے متاثر نظر آتا ہے۔کلکی اوتار کا ہندو عقیدہ عیسائی مذہب کی آمد سے بہت پہلے وجود میں آچکا تھا۔عین ممکن ہے کہ اس کے اثرات کسی طور کتابِ مکاشفہ کے سمجھنا تک جا پہنچے ہوں،جس نے اسے بعد میں عیسائی رنگ دے دیا ہو۔

ایسا عقیدہ جس کی بنیاد کوئی اُخروی ''مسیحا''(Savior) ہو اور اس بات پر ایمان رکھا جائے کہ اُس مسیحا کے ظہور کے ساتھ ہی سب کچھ آئیڈیلزم کی حد تک ٹھیک ہوجائے گا انگریزی میں "Messianic Faith" کہلاتا ہے۔اگر اُوپر بیان کردہ ہندو عقیدے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ہندومت بھی عیسائیت ، یہودیت ، زرتشت مت اور اسلام بالخصوص شیعہ مکتبہ فکر کی طرح ایک ''مسیحائی''(Messianic)مذہب ہے، جو اُخروی دور میں رونما ہونیوالی ڈرامائی تبدیلیوں کا منتظر ہے۔یہ ڈرامائی تبدیلیاں ہندو عقیدہ کے مطابق ''کلکی اوتار'' کی آمد کے بعد وقوع پذیر ہوں گی۔اور کلکی اوتار گھوڑے پر سوار اور ہاتھوں میں تلوار تھامے ''ہر غلط کو صحیح'' کرتا جائے گا۔

غیر سامی مذاہب میں ''مسیحائی'' پہلو کی موجودگی کی یہ کہانی صرف ہندومت پر ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ بُدھ مت اور جین مت بھی اُن ہندوستانی مذاہب میں شامل ہیں جو اُخروی مسیحا کے بیتابی سے

---

1. Dowson, John, *A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion,* New Delhi, 2004, page 40, art. "Avatara"

منتظر ہیں۔ مثال کے طور پر بُدھ مت کے پیروکار (بالخصوص مہا یان فرقہ) آخری ''بودھی ستوا'' (Bodhisattva) کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس بودھی ستوا کو دوسرے لفظوں میں اچھائی اور دانشمندی کا اوتار اور مہاتما بدھ کی شبیہ کہا جا سکتا ہے۔ اس بودھی ستوا کو جو نام دیا جاتا ہے، وہ ''مائیتریا''(Maitreya) ہے، جو مطلق اچھائی کی نمائندگی کرتا ہے۔ بُدھ عقیدہ کے مطابق بودھی ستوا کے ظہور کے ساتھ ہی دنیا بھر میں اچھائی پھیل جائے گی اور بدی نام کی کسی چیز کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ مزید برآں، جین مت کے ماننے والے بھی اپنے مذہب کے بانی ''مہاویر''(Mahavira) کی تعلیمات کے مطابق آخری ''عظیم پیشوا'' جسے سنسکرت میں ''تیرتھنکر''(Tirthankar) کہا جاتا ہے، کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ تا کہ اُس کے آنے کے ساتھ ہی جین مت کے پیروکاروں کی محرومیوں کا ازالہ ہو سکے اور جین مت ایک عالمگیر تحریک بن کر دنیا پر چھا جائے۔ علاوہ ازیں، آخری جین پیشوا کی آمد کے بارے میں جو وقت مہاویر کی تعلیمات میں بتایا گیا ہے، وہ لگ بھگ بہت قریب ہے، کیونکہ مہاویر کی تعلیمات کے مطابق اُس کی وفات کے چوبیس سو(2400) سال بعد آخری تیرتھنکر ظاہر ہوگا۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مہاویر کی وفات آج سے ساڑھے چوبیس سو سال پہلے پانچویں صدی قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ اس تناظر میں اگر ہم ہندوستانی مذاہب، جن کو "Vedic Religions" کہا جاتا ہے، کا نفسیاتی تجزیہ (Psycho-Analysis) کریں تو ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ تمام مذاہب دنیا کے خاتمے، اچھائی کے غلبے، بدی کے مغلوب ہونے اور ایک اُخروی عالمگیر شخصیت کے ظہور پذیر ہونے پر متفق ہیں۔ اصولِ تاریخ کی روشنی میں ہم ان تمام مذاہب کو جو مسیحائی عقائد پر کھڑے ہیں ''آئیڈیلزم'' کے سراب کا شکار کہہ سکتے ہیں۔

خطۂ برصغیر کی عظیم تہذیب سے اگر مغرب کا سفر کیا جائے تو پتا چلے گا کہ اہلِ فارس کے قدیم مذہب زرتشت مت میں بھی ''تصورِ مہدیت'' کی طرز پر پایا جانے والا عقیدہ موجود تھا۔ زرتشت مت کے پیروکار جنہیں بعد میں ''پارسی'' کہا گیا بھی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ خدائے یزداں کی طرف سے قربِ قیامت کے دنوں میں ایک ایسا انسان دنیا میں ٓ جائے گا جو ''مطلق اچھائی''(Absolute Good) کا

علمبردار ہوگا۔ اسی پارسی عقیدہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دجال کی طرز پر ماورائی قوتوں کے حامل ''مطلق برائی'' (Absolute Evil) کے نمائندے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

دیگر مذاہب کے طائرانہ جائزہ کے بعد اب ہم اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اسلام کی طرف آتے ہیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ اسلامی دینیات میں قیامت کا کون سا تصور غالب ہے۔ یہاں پر ہمارے استدلال کا اسلوب تنقیدی ہوگا اور ہم آج کے تصورِ قیامت کی ہیئت، ماخذ اور تعبیر پر ایک غیر جانبدارانہ جائزہ پیش کریں گے۔ تاکہ قارئین پر واضح ہو جائے کہ قرآن و حدیث میں قیامت اور اُخروی حالات کا جو منظر پیش کیا گیا ہے، اُس میں اور عصر حاضر کے تصورِ قیامت میں کتنی مماثلت ہے۔ ایک بات جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، وہ یہ ہے کہ موجودہ دینیاتی فکر میں تصورِ قیامت اور تصورِ مہدیت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ معروف عقیدے کے مطابق امام مہدی کا ظہور دنیا و مافیہا کے تابوت میں آخری کیل اور مراحل قیامت کے ابتداء کی پہلی کڑی ہے۔ تاہم ابھی ہم مسیحائی ہستی پر مبنی اس تصور کو مزید کھنگالنے کی بجائے صحیح احادیث میں روایت کردہ علاماتِ قیامت اور قربِ قیامت کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

اسلام اور تصورِ قیامت

Islam and Doomsday Conception

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

’’ساعت قریب آن پہنچی اور چاند شق ہو گیا۔‘‘

(سورۃ القمر،۱:۵۴)

’’سورۃ القمر‘‘ مکی سورت ہے اور کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس سورت کی پہلی آیت میں ہی دو عظیم واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلا واقعہ ’’شق القمر‘‘ کا ہے، جو رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے مکی دور میں پیش آیا۔ قرآنی اندازِ تخاطب کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ شق القمر کا واقعہ قرآنی پیراڈائم (Paradigm) میں خاص اہمیت کا حامل ہے اور اسے واقعات کے ایک حتمی دور کی ابتداء کے نشان کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ عصر حاضر کے معروف سمجھنا ہارون یحییٰ نے شق القمر سے مراد ’’کھودنا‘‘ لیا ہے اور یہ نقطۂ نظر اپنایا ہے کہ شق القمر کا واقعہ جولائی 1969ء کو انسان کے چاند پر اترنے کے وقت پیش آیا، جب امریکی خلا بازوں نے چاند کی سطح کو کھودا اور مٹی کے کچھ نمونے اکٹھے کیے[1]۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوف حضور اکرم ﷺ کے اشارے پر چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزہ کے قائل نہیں۔

جو دوسرا واقعہ اس آیت میں مذکور و مرکوز ہے، وہ ’’قیامت‘‘ کا وقوع پذیر ہونا ہے۔ آسان لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی تاریخ کے اس حتمی دور، جس کی ابتداء شق القمر سے ہوئی، کی انتہا ’’ساعت‘‘ نامی مرحلے پر ہوگی۔ قرآنی زبان اور طرزِ تخاطب سے واقف لوگوں کو ٹ ت اس بات کا علم ہوگا کہ قرآنِ حکیم میں ساعت سے مراد ’’قیامت‘‘ ہے۔ اور یوں ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آج ہم جس عہد میں جی رہے ہیں، وہ قرآنی تعلیمات کے مطابق انسان کی زمینی تاریخ کا آخری مرحلہ ہے اور اس کے اختتام پر جو کہ کسی بھی لمحے رُونما ہو سکتا ہے، قیامت کے دل دہلا دینے والے سلسلہ وار واقعات کی ابتدا ہو جائے گی۔

1۔ ہارون یحییٰ، اینڈ آف ٹائم، (مترجم: انجم سلطان شہباز)، مطبوعہ: جہلم بک کارنر، جہلم، 2009، صفحات 46-47

اب ہم ایک نظر قیامت کی ہیئت پر ڈالتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں قیامت کے ظہور کا اطلاق کس پیمانے (Magnitude) پر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں پر متشکک ذہنوں میں یہ سوال ضرور اُبھرے گا کہ قیامت آیا کہ محض زمین پر واقع ہوگی، نظام شمسی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گی یا پھر پوری کائنات پر قیامت کی وقوع پذیری کا اطلاق ہوگا؟ اس کی بجائے کہ ہم ان سوالات کے جواب میں خود ساختہ تاویلات پیش کریں، بہتر ہوگا کہ قرآن حکیم کی قیامت کے متعلق پیش کردہ سب سے جامع تصویر کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

''جب سورج واپس لپیٹ لیا جائے گا۔ اور جب ستارے بے مدار کر دیئے جائیں گے۔ اور جب پہاڑ ہوا میں (گرد کی مانند) اُڑا دیئے جائیں گے۔ اور جب حاملہ اونٹنیاں بے مہار پھریں گی۔ اور جب وحشی جانور جمع کر دیئے جائیں گے اور جب سمندر میں اُبال آ جائے گا۔''

(تکویر، ۱-۶:۸۱)

کثیر جہتی مطالعہ رکھنے والے قارئین اس بات سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ ان چھ آیات میں مذکور موضوعات چھ مختلف شعبہ ہائے علم (Science) سے تعلق رکھتے ہیں۔ سورج اور ستاروں کا مطالعہ ''علم طبیعات'' (Physics) اور ''علم فلکیات'' (Astronomy) کا موضوع ہے۔ پہاڑی سلسلے ''علم ارضیات'' (Geology) کے زیر مطالعہ آتے ہیں۔ مزید برآں جانوروں کا مطالعہ ''علم حیوانات'' (Zoology) کے تحت کیا جاتا ہے۔ جبکہ سمندری مطالعہ کے علم کو ''علم بحر'' (Oceanography) کہتے ہیں۔ اور یوں معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم میں بیان کردہ تصورِ قیامت کا اطلاق کسی محدود پیمانے کی بجائے کل کائنات (Universe) پر ہوتا ہے۔ عرفِ عام میں اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کہکشاؤں کے دور افتادہ مداروں سے لے کر زمین پر رینگنے والے چھوٹے چھوٹے حشرات تک ایک ہی وقت میں طاری کر دی جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں کائنات کی ہر چیز کو اُس دن موت دے دی جائیگی۔ کائنات کی اس مطلق تباہی کو قرآنی زبان میں ''قیامت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت سورۂ مومن کی آیت 59 سے بھی کی جا سکتی ہے۔ جہاں قیامت کو آسمانوں اور زمین پر اچانک واقع ہونے والا ''بھاری حادثہ'' قرار دیا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں ماضی میں غضبِ الٰہی کا شکار ہو کر تباہ ہونے والی کچھ قوموں کے واقعات بھی ملتے

ہیں، جن سے ہمیں قیامت کی ہیئت اور ہیبت کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے!

’’اور وہ بستیاں جنہوں نے ظلم کیا تو ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اُن کی تباہی کیلئے ایک وقت متعین کر رکھا تھا۔‘‘

(سورۃ الکہف، ۱۶:۵۹)

آیتِ مذکورہ بالا میں ایک نکتہ جو ہماری توجہ کا مستحق ہے، وہ اللہ ربّ العزت کی طرف سے بستیوں کی تباہی کا وقت بہت پہلے مقرر کر دیا جانا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تباہی کا مقررہ وقت کسی بھی صورت ٹلنے والا نہیں اور جو ’ساعت‘ مقرر کی جا چکی ہے، اسے کوئی قوت بدل نہیں سکتی۔ یہاں پر ایک اور آیت کا تذکرہ موضوع کی نسبت بہت موزوں رہے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’جب اُن کا وقتِ معیّن آ جائے گا، تو نہ ایک گھڑی پیچھے رہیں گے اور نہ ہی آگے بڑھیں گے۔‘‘

(سورۃ النحل، ۱۶:۶۱)

قیامت کا اعلان کیسے ہوگا؟ کس حادثہ سے واقعاتِ قیامت کی ابتدا ہوگی؟ یہ بڑے ہی گنجلک سوالات ہیں۔ تاہم قرآن کہیں اس معاملے پر بھی خاموش نہیں اور بڑے ہی جامع انداز میں ان سوالات کا جواب دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’اور جب آواز چھوڑی جائیگی، تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب بے زندگی کر دیئے جائیں گے۔‘‘

(سورۃ الزمر، ۳۹:۶۸)

اسلام کے ظہور سے آج تک ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں، جو کسی نہ کسی انداز سے قیامت کا انکار کرتے آئے ہیں۔ چونکہ کفارِ مکہ بھی اسی روش پر چلتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کے قیامت کے بارے میں میں شکوک وشبہات پر کاری ضرب لگاتے ہوئے سورۂ حج میں وعدہ فرمایا:

’’اور یہ کہ قیامت ضرور آئے گی۔ (اُس کے آنے میں) کسی قسم کا شک نہیں اور اللہ ضرور اٹھائے

گا،اُن کو جو قبروں میں پہنچ چکے ہیں۔''

(سورۃ الحج،۷:۲۲)

اس آیت کے نزول سے نہ صرف کفارِ مکہ کے منہ بند ہوگئے، بلکہ قیامت کے موضوع پر ایک ایسا قرآنی مؤقف بھی سامنے آیا، جو ہر منکرِ قیامت کیلئے قیامت کے حتمی ہونے کا وعدہ قرار پایا۔لیکن یہ موقف وعدہ کے ساتھ ساتھ ایک ایسی قرآنی دلیل بھی ہے جو ہر منکرِ قیامت کو دوبارہ زندہ کر کے خدا کے حضور جوابدہ ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔

''اور وہ لوگ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب واقع ہوگی؟ تو آپؐ فرما دیجئے کہ کچھ عجب نہیں کہ (قیامت کی گھڑی) قریب ہی آن پہنچی ہو۔''

(سورۂ بنی اسرائیل،۵۱:۱۷)

اب کچھ گفتگو قیامت کے لسانی پہلو کے حوالے سے بھی کرتے چلیں۔''قیامت'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں''قائم کرنا، کھڑا کرنا، زندگی لوٹانا، روک دینا۔'' اس لحاظ سے ہم قیامت کو دو معنوں میں سمجھ سکتے ہیں۔ پہلا مفہوم ایک ایسی تباہی کا ہے جو کائنات پر طاری کر دی جائے گی اور دوسرا مردوں کا قبروں سے زندہ اُٹھایا جانا۔

ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے خود کو لفظِ قیامت کے پہلے معنی یعنی''کائنات کی مکمل تباہی'' تک محدود رکھیں گے۔اس بات کی وضاحت تو قرآن کچھیں کی نصِ قطعی سے کی جا چکی ہے کہ قیامت کی ہیئت اور تباہی کا پیمانہ کیا ہوگا۔اب ہم اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اسلام نے قیامت کیلئے کون سا وقت سب سے موزوں قرار دیا ہے۔مزید برآں اگر ہم اس''ساعتِ قریب'' کی مزید وضاحت حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں احادیثِ نبویؐہ میں دیئے گئے قیامت کے ٹائم فریم پر غور کرنا ہوگا۔کیونکہ احادیثِ نبویؐہ میں قیامت، اس کی علامات، اوقات اور اطلاق کے بارے میں پیشگوئیوں کا ایک ضخیم ۔ تعہ موجود ہے۔ یہ بات بڑی حد تک یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ قیامت سے متعلق احادیث کا اگر نظامیاتی (Systematic) اور سائنسی (Scientific) مطالعہ کیا جائے تو ہم قیامت کے ظہور کے وقت کا تعیّن بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔نظامیاتی سائنسی مطالعہ درحقیقت''کثیر جہتی تحقیق'' کا نام ہے، جس میں امکانات پر مبنی ہر نکتہ کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

اسلام نے قیامت کا جو تصور حدیث میں پیش کیا ہے، اُس میں ظہورِ قیامت کو تین طرح کے واقعات سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ ان تین طرح کے واقعات کو ہم دینیاتی اصطلاح میں مندرجہ ذیل نام دیتے ہیں۔

i۔ علاماتِ صغریٰ / متوسلہ

ii۔ علاماتِ کبریٰ / قربیہ

iii۔ علاماتِ بعیدہ[1]

یہاں پر اس امر کی وضاحت کرنا لازم ہوگا کہ ان واقعات کا پورا ہونا قیامت کے موضوع پر جمع کردہ ذخیرۂ حدیث کی سند اور صحت کی ثقاہت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ تاہم ایسی احادیث جن میں موجود پیشگوئیوں کا پورا ہونا ابھی باقی ہے، ہم اُن کی صحت پر استدلال ماضی میں سچ ثابت شدہ احادیث سے مطابقت کے تحت کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسی احادیث جو اسلام کے قیامت کے موضوع پر عمومی مزاج سے متصادم ہوں یا جن میں سائنسی اور تاریخی اغلاط موجود ہوں، ایسی خبروں کو ہم بلا جھجک مسترد کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حدیث جو کہ بخاری میں منقول ہے، میں حضور اکرم ﷺ سے ایک سائنسی غلطی منسوب کی گئی ہے۔ روایت میں کہا گیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''قیامت کے دن سورج اور چاند ستارے سمندروں میں ڈال دیئے جائیں گے۔'' یہ بیان صریح سائنسی غلطی پر مبنی ہے، جسے بطورِ حدیث تسلیم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑے گا۔

اب ہم واپس علامات کے موضوع کی طرف چلتے ہیں اور قیامت کے واقع ہونے کی سب سے بڑی علامت کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت اور اسلام کا دنیا بھر میں پھیل جانا ازخود قیامت کی سب سے بڑی نشانیاں ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل قیامت کا آنا قطعی طور پر ناممکن تھا، کیونکہ انسانیت میں اُس ہستی کے ظہور جس کی آمد کا وعدہ ہر نبیؑ نے کیا تھا، تکمیلِ نبوت کے اپنی انتہا پر پہنچنے اور انسانیت کی حتمی فکری رہنمائی کے بغیر قربِ قیامت کے دور کا آغاز نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم آپ ﷺ

1۔ مولانا مفتی رفیع عثمانی، علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم، کراچی، 2008، صفحہ 129

کے مبعوث کر دیئے جانے کے بعد قیامت کی کسی بھی لمحے رونما ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس امر سے جو چیز واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعثتِ محمدی ﷺ کے بعد سے انسان قربِ قیامت (End Times) کے دور میں رہتا آ رہا ہے اور اب جونہی باقی علاماتِ قیامت پوری ہو جائیں گی، قیامت وقوع پذیر ہو جائے گی۔ تاہم معلومات کو حتمی شکل دینے کے لیے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ تمام علامات تاریخ کی مکمل روشنی میں ظہور پذیر ہوں اور غیر جانبدار ذرائع اُن واقعات کے رونما ہونے کی گواہی دیں جو احادیثِ نبویہؐ میں بطورِ علامات درج ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں رونما ہونے والی ہر غیر معمولی تبدیلی کو عالمگیر سطح پر دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی واقعہ آج ایسا نہیں رہا جس کی حقانیت یا کذب کے بارے میں جدید دور کا انسان حتمی رائے قائم کرنے کے قابل نہ ہو۔

احادیثِ نبویؐہ میں بڑے خوبصورت پیرائے میں ایک خاص ترتیب کے تحت علاماتِ قیامت کو بیان کیا گیا ہے۔ ہم بھی موجودہ بحث میں اس ترتیب کو برقرار رکھتے ہوئے اور پہلے پوری ہو چکنے والی علامات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے قارئین کو منطقی نتائج کی طرف لے جائیں گے۔

''رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''علاماتِ قیامت یوں وقوع پذیر ہوں گی جیسے تسبیح کے دانے تسبیح ٹوٹ جانے سے قطار میں گرتے چلے جاتے ہیں۔''

(جامع ترمذی)

اگر صرف مندرجہ بالا حدیث کو ہی تحقیقی نگاہ سے پرکھ لیا جائے تو جو تشریحات سامنے آتی ہیں، وہ یہ یقین دلانے کیلئے کافی ہیں کہ قربِ قیامت کا دور اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ گزشتہ صدی سے یہ بات انسانی ریکارڈ میں ہے کہ آسمانی وقدرتی آفات، انسانی جنگ وجدل، حادثات اور لادینیت، نہ صرف اپنے عروج پر پہنچ چکے ہیں، بلکہ یہ سب واقعات تسبیح کے دانوں کی طرح پے در پے رونما ہوتے جا رہے ہیں۔

''قیامت اُس وقت تک واقع نہ ہوگی۔ جب تک تواتر سے زلزلے نہ آنا شروع ہو جائیں۔''

(بخاری)

آپ ﷺ نے مزید فرمایا:

''قیامت سے پہلے (عالمگیر نوعیت کے) دو عظیم واقعات رُونما ہوں گے اور پھر اس کے بعد دس سال تک تواتر سے زلزلے آتے رہیں گے۔''

(بخاری)

گزشتہ صدی سے زلزلوں میں مرنے والے لوگوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں اکتوبر 2005ء میں آنے والے زلزلے میں لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بنے[1]۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں سالانہ چودہ ہزار (14000) کے لگ بھگ چھوٹے بڑے زلزلے آتے ہیں۔ ایک اور بات جو مؤخرالذکر حدیث میں بیان کی گئی ہے وہ قیامت سے پہلے دو عظیم واقعات کا رونما ہونا ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ دو عظیم واقعات ستمبر 2001ء میں ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' (نیویارک) اور ''پنٹاگون ہیڈ کوارٹرز'' (واشنگٹن) پر کیے گئے وہ حملے ہیں، جن کے عالمگیر اثرات نے ساری دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اگر ہم اس سارے عمل کو ایک ہی واقعہ سمجھنے پر اکتفا کریں اور دوسرے عالمگیر نوعیت کے واقعہ کو الگ سے تلاش کرنا شروع کر دیں تو ہمیں اس کے لیے بھی زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی، کیونکہ 2002ء میں امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کی طرف سے عراق پر کیا گیا حملہ وہ دوسرا بڑا واقعہ ہے جس نے موجودہ دنیا کے اہداف کو بڑی حد تک واضح کر دیا ہے اور دنیا اب دو بلاکوں میں منقسم ہو کر نظریاتی جنگ لڑ رہی ہے۔ مزید برآں 2001ء سے اب تک زلزلوں، سونامیوں اور سمندری طوفانوں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور امریکہ سے لے کر نیوزی لینڈ تک کے علاقے ان آفات کی زد میں آ چکے ہیں، جس کے باعث کروڑوں لوگ ہلاک اور بے گھر ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اوپر بیان کیے گئے فرمانِ نبویؐ کی روشنی میں ہمیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہو رہی کہ آج ہم قیامت کا تعیّن سال چھینوا اور دن کی حد تک وضاحت سے کر سکتے ہیں۔ پیچھے پیش کردہ اعداد و شمار اس کتاب میں زیرِ بحث تاریخ 21 دسمبر 2012ء کی بطور یومِ قیامت تصدیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 2001ء میں افغانستان پر ہونے والے امریکی حملے کو ''ہرمجدون'' (Armageddon) یعنی حتمی معرکۂ حق و باطل کے سلسلے کی ابتداء کہا جا سکتا ہے، کیونکہ تب سے آج تک دنیا جو نظریاتی جنگ لڑ رہی ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جو ظلم کی نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے، وہ یہ واضح کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ 2001ء کے ٹھیک 10 سال بعد یہ سلسلہ وار واقعات اپنی انتہا پر پہنچ

1۔ حالیہ برسوں میں آنے والے بڑے زلزلوں میں ہونے والی ہلاکتوں کے اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں:
2001ء (بھارت: 20085 ہلاکتیں)، 2002ء (افغانستان: 1000)، 2003ء (ایران: 31000)، 2004ء (انڈونیشیا، سمندری زلزلہ ''سونامی'': 229000)، 2005ء (پاکستان: 100000)، 2006ء (انڈونیشیا: 6234)، 2007ء (پیرو: 519)، 2008ء (چین: 69197) 2009ء (اٹلی: 300)،

جائیں گے اور یوں دنیا اچانک حادثۂ قیامت سے دوچار ہو جائیگی۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا طائرانہ جائزہ لینے پر بھی معلوم ہو جائے گا کہ 2001ء کے بعد دنیا کا امن وسکون برباد ہو گیا اور ہر گزرنے والا دن دنیا بھر میں خوف و بے چینی میں شدت کا باعث ہی بنا۔

عراق جنگ یا اسکی پیشرو افغانستان جنگ میں سے کسی ایک کو اس لیے بھی ہر مجدون جنگوں کے سلسلے کی ابتدا قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان دونوں جنگوں میں بیشتر بیتہ ن ملکوں جن میں پاکستان بھی شامل ہے نے ''رومیوں'' یعنی عیسائی مغربی اتحاد کا ساتھ دیا۔اس وفا داری پر پاکستان کو Major Non-NATO Ally (MNNA) کا تمغہ 2004ء میں عطا کیا گیا جس پر ہماری غیرت مند قوم ہرگز فخر نہیں کرسکتی۔ لہٰذا آج کے معروضی حالات کو دیکھتے ہوئے جو بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے، وہ یہی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ حالات ہمیں بڑی تیزی سے قیامت کی طرف لے جارہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک اور جگہ فرمایا۔

''قیامت نہیں آئے گی، جب تک جنگ وجدل بہت بڑھ نہ جائے۔''

(متفق علیہ)

عصرِ حاضر کا ہر وہ شخص جو حالاتِ حاضرہ سے ذرا سا بھی واقف ہے جانتا ہے کہ یہ حدیث اپنے معنی ومفہوم میں 100% پوری ہو چکی ہے۔ بے شک آج کے انسان نے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کا گلہ کاٹنے کا ایسا انتظام کرلیا ہے، جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پچھلی صدی کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ آج کی جنگوں میں قتل وغارت گری ماضی کے مقابلے میں کئی ہزار گنا بڑھ چکی ہے۔ یورپ میں جب ''مشین گن'' (Fully Automatic Machine Gun) کی ایجاد ہوئی تو کچھ معاصر مبصرین کی طرف سے یہ معروف فقرا کسا گیا:

''اہلِ یورپ عرصۂ دراز سے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کیلئے کسی ایسے ہتھیار کی تلاش میں تھے، جو تیزی سے اپنا کام سرانجام دے اور انہیں یہ ہتھیار مشین گن کی صورت میں دستیاب ہو گیا ہے۔''

پہلی جنگِ عظیم (World War I) میں تین کروڑ انسان اپنے ہی بھائیوں کی بربریت کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن گئے۔ اپنی ہولناکی کی وجہ سے پہلی جنگِ عظیم عرصۂ دراز تک ایسی جنگ سمجھی جاتی رہی، جس کے لڑے جاچکنے کے بعد انسان مزید کوئی جنگ لڑنے کا متحمل نہیں رہا تھا۔ اسی لیے سیاسی وجنگی مبصرین نے

جنگِ عظیم اوّل کے بارے میں ایک خاص فقرہ استعمال کیا۔

"A war to end all wars."

(ایک ایسی جنگ جس نے مستقبل کی سب جنگوں کا راستہ بند کر دیا۔)

تاہم بیسویں صدی کی یہ توقع عبث ثابت ہوئی اور انسان کی جنگی فطرت نے محض 20 سال کے بعد ہی دنیا کو دوسری عالمگیر جنگ میں دھکیل دیا۔ دوسری جنگِ عظیم (World War II) میں کل ملا کر 7 کروڑ جانیں ضائع ہوئیں۔ اس جنگ کی خاص بات نیوکلیائی ہتھیاروں کا استعمال تھا، جو کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے جاپان کے خلاف استعمال کیے گئے۔ 5 اگست 1945ء کو پہلا ایٹم بم ہیروشیما اور 9 اگست کو دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرایا گیا۔ اس کے باعث جہاں ایک طرف یہ دونوں شہر ملیا میٹ ہو گئے، وہیں دوسری طرف وہ علاقے جہاں جہاں تک ایٹم بم کے اثرات پہنچے تھے آج تک ٹھیک طرح سے انسانی رہائش کے قابل نہیں بنائے جا سکے۔ عظیم شہروں کی یہ ناقابلِ تلافی تباہی ایک حدیثِ نبویؐ کی سو فیصد تعبیر ہے، جس میں فرمایا گیا (درحقیقت پیشین گوئی کی گئی) کہ "بڑے بڑے شہر پوری طرح تباہ کر دیئے جائیں گے، جیسے اُن کا وجود تک نہ تھا[1]۔"

ایک اور حدیث میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قیامت کے قائم ہونے کے نزدیک حرج بہت بڑھ جائیگا اور (پھر فرمایا کہ) حرج قتل و غارت گری کا نام ہے۔"

(بخاری)

بجائے اس کے کہ موجودہ موضوع پر مزید تفصیل میں جایا جائے، ہم قارئین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ میڈیا کی مدد سے اپنے اردگرد کے حالات کا جائزہ لیں۔ اخبارات کا مطالعہ کر کے اور نیوز چینلز کو دیکھ کر بڑی آسانی سے یہ جانا جا سکتا ہے کہ بم دھماکوں، قاتلانہ حملوں، باہمی تصادم، سرحدی جھڑپوں، علیحدگی پسند تنظیموں کی کاروائیوں اور ان ہی جیسے مزید واقعات میں ہر روز کتنے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

1۔ المتقی الهندی، البرہان

ایسے معروضی حالات میں راقم الحروف کا آپ سے سوال ہے کہ حالات ہمیں کس طرف لے جا رہے ہیں؟ کیا آپ کو ابھی بھی لگتا ہے کہ مندرجہ بالا احادیث میں موجود پیشگوئیوں کے پورا ہو چکے ہونے میں کوئی شک باقی ہے؟

احادیثِ نبوؐیہ میں موجود دوسرا نکتہ جو متفرق علاماتِ قیامت میں سے ایک اہم علامت ہے، اخلاقی انحطاط کا آخری حدوں پر چلے جانا ہے۔ بخاری شریف میں یہ فرمانِ نبویؐ مذکور ہے کہ ''قربِ قیامت میں ناجائز جنسی جفتی سرِ عام اور بکثرت ہوا کرے گی۔''

مزید برآں، علامہ جلال الدین سیوطیؒ یوں رقمطراز ہیں:

''قربِ قیامت میں مرد عورتوں کے انداز اپنائیں گے اور عورتیں مردوں کے انداز۔''

(دُرِّ منثور)

یہاں انتہائی دلچسپ امر یہ ہے کہ بالکل یہی پیشگوئی قدیم انگلستان کے ایک معروف کاہن ''مرلن'' (Merlin) نے بھی کی تھی۔ جس کا حوالہ ماہرینِ آثارِ قیامت بار بار دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً سبھی ثقافتوں اور مذاہب کے لوگ عورتوں اور مردوں کے ایک دوسرے کی پیروی کرنے کے عمل کو قربِ قیامت کے آثار میں سے ایک گردانتے ہیں۔ آج کا عالمگیر کلچر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ مرد ہیجڑا پن اور لمبے بالوں کی صورت میں اور عورت چھوٹے بالوں اور مردانہ لباس کی صورت میں ایک دوسرے کی نقالی کر رہے ہیں۔

قیامت کی علامات کے سلسلے میں ایک اور ارشادِ نبویؐ ہے:

''لوگ کثرت سے ہم جنس پرستی کی بیماری میں مبتلا ہو جائیں گے۔''

(کنز العمال)

ہم جنس پرستی (Homosexuality) جس کی مردانہ شکل کو ''لواطت'' (Sodomy) اور زنانہ شکل کو ''مادہ ہم جنسیت'' (Sapphism/Lesbianism) کہتے ہیں، کو ہر مذہب نے مطلقاً حرام قرار دیا ہے۔ اسلام نے شرک کی طرح اس معاملے پر بھی ''نو کمپرومائز'' (No Compromise) والا رویہ رکھا ہے اور ہم جنس پرستی کو اللہ سے کھلی بغاوت اور اُس کی لعنت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی شریعت نے ہم جن پرستی کے مرتکب افراد کیلئے شدید سے شدید تر سزائیں رکھی ہیں اور آج بھی سعودی عرب، ایران اور

افغانستان ایسے ...ین ممالک ہیں جہاں ہم جنس پرستی کی سزا موت ہے۔ تاہم جو بات باعثِ فکر ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اور اخلاقیات کی طرف سے اس قدر شدید مخالفت کے باوجود عصرِ حاضر میں ہم جنس پرستی کے رجحان کی جو عالمگیر لہر مرد و زن دونوں میں دیکھی گئی ہے، وہ خوفناک حد تک ناقابل یقین ہے۔ ساری دنیا میں LGBT (Lesbian, Gay, Bisexual & Transgender Rights) کیلئے جو تحریکیں سرگرم ہیں اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مزید برآں ''ہم جنس شادی'' (Homosexual Marriage) ہم جنس پرستی کی ایک جدید شکل ہے جسے قانونی قرار دیئے جانے کے حوالے سے ساری دنیا میں بحثیں چل رہی ہیں۔ یہ امر حیران کن ہے کہ 2001ء میں جبکہ ابھی امریکہ جیسے ملک میں ہم جنس شادی کی شدید مخالفت ہو رہی تھی، ہالینڈ نے اس کو سرکاری سطح پر اپنانے اور آئین کا حصہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ 2001ء سے اب تک بیلجیئم (Belgium)، کینیڈا، ناروے، سویڈن، سپین اور امریکہ کی کچھ اندرونی ریاستوں نے ہم جنس شادی کو انسان کے پیدائشی اور آئینی حقوق کے عین مطابق قرار دیتے ہوئے اس کی عام اجازت دے دی ہے۔ اس کے علاوہ نیپال، یوراگوئے، آئس لینڈ، لکسمبرگ، پرتگال، ارجنٹائن، سلوونیا اور وینزویلا ایسے دیگر ممالک ہیں، جہاں ہم جنس شادی اور ہم جنس پرستی کی دوسری شکلوں کو جائز قرار دینے کیلئے پارلیمانوں میں قانونی بحث و تمحیص جاری ہے۔

اس ساری اخلاقی انحطاط پر مبنی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کیا اب بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا احادیث میں بیان کردہ علامات کے ظہور میں ابھی کچھ وقت باقی ہے؟ اخلاقی پسماندگی کی یہ انتہا آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کا ...عی رجحان ہم جنس پرستی کی طرف یوں کبھی نہیں ہوا۔ اسی طرح سرِ عام جنسی اختلاط آج ناسور کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یورپ کی ننگ دھڑنگ ثقافت حوا کی بیٹیوں کی عصمتوں کا سودا بازاروں، چوراہوں، تھیٹروں، سینما گھروں اور ٹی وی چینلز پر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اخلاق کی اس پستی کو بجائے شرمندگی کے ''وقار کی علامت'' (Status Symbol) سمجھا جاتا ہے۔ مرد و زن اس بات پر بھی فخر محسوس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ ''بوائے فرینڈ'' اور ''گرل فرینڈ'' جیسی شرمناک نعمتوں سے محروم نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں یورپ و امریکہ میں ایک طرف یہ سب خرافات موجود ہیں، وہیں دوسری طرف ''پورنو'' (Porno) فلموں میں کام کرنا پیسے شہرت کے حصول کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب یہ معاملہ محض

یورپ تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اس نے تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لے کر دنیا بھر کی نوجوان نسل کے اخلاق تباہ کر دیئے ہیں۔ ٹ ت حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے اور حقیقت کا ادراک رکھنے والے لوگ موجودہ حالات میں قیامت کو مستقبل قریب میں رونما ہونے والا ایک ایسا ناگزیر حادثہ سمجھتے ہیں، جس سے بچنا ناممکن ہے۔

قیامت کے مستقبل قریب میں ظہور کے حوالے سے احادیث میں موجود چند مزید پیشگوئیوں کا تذکرہ اور اُن کے پورے ہونے کے ثبوتوں کا جائزہ موضوع کے اعتبار سے ہرگز دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ ان پیشگوئیوں پر عالمانہ انداز میں کیا جانے والا تبصرہ قارئین کے لیے حتمی نتائج پر پہنچنے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا اور وہ انشاءاللہ اس کتاب میں پیش کردہ ہمارے موقف سے متفق ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں کریں گے۔

حضوراکرم ﷺ نے علاماتِ قیامت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''قیامت تب تک قائم نہ ہوگی، جب تک لوگ بلند و بالا عمارات بنانے میں مقابلہ بازی شروع نہ کردیں۔''

(بخاری)

''قربِ قیامت میں طلاق روزمرہ کا معمول بن جائے گی۔''

(احوالِ قیامت از علامہ صفرینی)

''اُس دور میں ناجائز پیدائشوں کی کثرت ہوگی۔''

(الہندی/ کنزالعمال)

''قیامت تب واقع ہوگی، جب لوگ ستاروں میں یقین کرنے لگیں اور حکم الٰہی کو نظرانداز کردیں گے۔''

(الھیثمی، کتاب الفتن)

''میری اُمت پر ایک وقت آئیگا، جب لوگ قرآن کی (بکثرت) تلاوت کریں گے۔لیکن قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔''

(بخاری)

''قربِ قیامت میں سال ہا سال تک بے یقینی چھائی رہے گی۔ لوگ (بے یقینی کے عالم میں) ایک جھوٹے پر تو یقین کرلیں گے، لیکن سچے کو دُھتکار دیں گے۔''

(مسند احمد بن حنبل)

''تم مسجدوں کو یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں کی طرح سجاؤ گے۔''

(ابوداوَد)

''عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن کو تیر کی طرح درست کریں گے۔ لیکن اُن کا مقصد قرآن پڑھنے سے دنیا حاصل کرنا ہوگا اور وہ اس کے ذریعے آخرت نہ سنواریں گے۔''

(بیہقی)

''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ کوئی شخص بھی یہ پرواہ نہیں کرے گا کہ اُس نے جو کچھ حاصل کیا وہ حلال طریقے سے آیا یا حرام طریقے سے۔''

(بخاری)

''لوگوں پر ایک ایسا وقت ضرور آئیگا کہ کوئی بھی شخص ایسا باقی نہ رہے گا جو سود کھانے والا نہ ہو۔ اگر وہ سود نہیں بھی کھائے گا تو اُس کو سود کا غبار ضرور پہنچ جائے گا۔''

(مسند احمد بن حنبل۔ ابوداوَد)

مذکورہ بالا حدیث، تہذیب حاضر کے سود پر مبنی بینکاری نظام پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ عالمگیر سرمایہ دارانہ نظام نے جہاں سود کو روز مرہ کاروباری زندگی کا لازمی حصہ بنا دیا ہے، وہیں اسے منافع کا نام دے کر انتہائی عام اور آسان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں سرکاری تنخواہوں اور ادائیگیوں سمیت وہ تمام مالی معاملات جو بینکاری نظام کے توسط سے انجام پاتے ہیں، اُن پر بھی اس نظام کی خرابیوں اور قباحتوں کی وجہ سے شرعی عذر آ سکتا ہے۔ اس حدیث کے الفاظ ''اُس کو سود کا غبار ضرور پہنچ جائے گا'' اس قدر واضح اور معنی خیز ہیں کہ آج کے سودی نظام پر ان کے اطلاق کا انکار کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی ایک اور علامت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''قیامت تب تک قائم نہ ہوگی، جب تک کچھ لوگ اپنی زبانوں کے ذریعے پیٹ نہ بھرنے لگ پڑیں۔''

(مشکوٰۃ شریف)

''قیامت کی نشانیوں میں ہے کہ عورتیں ایسی لڑکیاں جننے لگیں جو اُن پر حکم چلائیں اور (پھر آپ ﷺ نے فرمایا) تم دیکھو گے کہ ننگے پیر اور ننگے بدن والے تنگ دست اور چرواہے مکانات کی بلندی پر فخر کرنے لگیں گے۔''

(متفق علیہ)

مؤخر الذکر حدیث میں ایک طرف تو ایسی الٹرا ماڈرن لڑکیوں کی طرف اشارہ ہے، جنہیں نام نہاد آزادی کے سراب نے تمام اخلاقی حدود سے آزاد کر کے والدین کا نافرمان اور بدکردار بنا دیا ہے، اور دوسری طرف ایک واضح اشارہ عرب کی ریگستانی زندگی کی طرف ہے۔ صحرائے عرب میں چند ہی سال پہلے تک لوگوں کی کثیر تعداد تنگ دستی کی زندگی گزار رہی تھی، جبکہ آبادی کا بڑا حصہ خیموں میں رہا کرتا تھا۔ عربوں کی اکثریت چرواہوں پر مشتمل تھی، کیونکہ وہاں چٹیل پہاڑ اور صحرا ہونے کے باعث زراعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لہٰذا عربوں کے ہاں مویشی پالنا ہی روزگار کا آسان ترین ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ تاہم تیل کی دریافت اور اس کی عالمگیر سطح پر فروخت نے عرب ممالک، بالخصوص سعودی عرب کو امیر کبیر بنا دیا ہے۔ تیل کی عطا کردہ دولت کی ریل پیل نے ہر شخص کو کاہل اور آرام پرست بنا دیا ہے اور اب وہاں کا مقامی ہر باشندہ ٹھاٹھ باٹھ سے محل نما گھر میں رہائش پذیر ہے، جس کے سامنے تین تین پرتعیش گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ 1960ء کی دہائی سے پہلے عربوں کی اکثریت بدوی زندگی گزار رہی تھی اور وہ جدید طرزِ تعمیر سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ اُن کیلئے حصولِ رزق کا سب سے بڑا ذریعہ گلہ بانی تھا، جس کے باعث خانہ بدوشی عام تھی۔ لوگ نت نئی چراگاہوں اور چشموں کی تلاش میں رہتے تھے۔ تاہم صنعتی ترقی کے ساتھ ہی جب دنیا بھر میں تیل کی کھپت بہت زیادہ بڑھ گئی تو عربوں پر دولت کے دروازے کھل گئے۔ تب سے ائیر کنڈیشنڈ محلات اور بڑی بڑی گاڑیاں ریگستانی زندگی کا اٹوٹ جزو بن گئیں۔ صحرا کے اندر سڑکوں کا جال بچھ گیا۔ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارات بن گئیں۔ یوں سورج کا جلایا ہوا صحرائے عرب ایک بالکل مختلف دنیا کی تصویر پیش کرنے لگا۔

''حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک زمانہ آئے گا جب مختلف گروہ تمھیں (بیت۔ نوں کو) ختم کرنے کیلئے ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گے، جیسے کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو پیالہ پر دعوت دیتے ہیں۔ یہ سن کر ایک صحابیؓ

نے سوال کیا: یارسول اللہ ﷺ کیا ہم اُس وقت تعداد میں بہت کم ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔نہیں! بلکہ تمھاری تعداد بہت زیادہ ہوگی۔لیکن تمھاری مثال گھاس کے اُن تنکوں کی مانند ہوگی جو پانی پر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور پانی کا ریلا اُن کو جس طرف چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے اور خدا ضرور تمھارے دشمنوں کے دلوں سے تمھارا رُعب نکال دے گا، کیونکہ تمھارے دلوں میں وہن پیدا ہو جائیگا۔۔۔ اور (فرمایا) وہن دنیا سے محبت اور موت سے خوف کا نام ہے۔''

(ابوداوٗد)

راقم الحروف کے ذاتی خیال میں یہ حدیث اس قدر صحیح اور جامع معلومات کی حامل ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اور کوئی ارشاد نہ بھی فرماتے اور قربِ قیامت کے حوالے سے محض اسی ایک حدیث پر اکتفا فرما لیتے تو یہ اکیلی حدیث بھی آپ ﷺ کی نبوت کے منجانب اللہ ہونے کی تصدیق کیلئے کافی تھی۔سلطنتِ عثمانیہ کے ترکی اور سلطنتِ مغلیہ کے ہندوستان میں اٹھارہویں صدی میں بیک وقت زوال کے بعد ۔۔۔ن دوبارہ اس قابل کبھی نہیں ہو سکے کہ وہ اہلِ مغرب کے سامنے پوری شان وشوکت سے کھڑے ہوسکیں۔ یورپی ''نشاۃ الثانیہ'' (Renaissance) کا ظہور اگرچہ سولہویں صدی عیسوی میں ہوا، لیکن اس کی جڑیں صلیبی جنگوں کے اندر تھیں۔جبکہ اس کی پختہ مادی شکل انیسویں صدی میں سامنے آئی۔یورپی تہذیب کے ظہور وارتقاء سے پہلے ۔۔۔ن تمام مہذب دنیا کے وارث تھے اور اسلام کا سکہ مشرق ومغرب میں چلتا تھا۔ لیکن پچھلے تین سو سالوں کے دوران ساری کایا ہی پلٹ گئی۔ 1857ء کی جنگِ آزادیٔ ہندوستان میں انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کا رسمی خاتمہ بھی کر دیا۔ ۔۔۔ن اپنی کثرت اور مقامی حمایت کے باوجود ہار گئے۔لیکن اس شکست سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ اس پوری جنگ کے دوران چار ہزار سے زائد انگریز بیک وقت ہندوستان میں موجود نہیں رہے۔اسی طرح پہلی جنگِ عظیم (World War I) میں مغربی اتحاد جس میں برطانیہ اور فرانس معروف ہیں نے سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا اور اس کے صوبوں کی بندر بانٹ کر کچھ اہم علاقوں کو اپنی کالونیوں کا درجہ دے دیا، جبکہ باقی علاقوں کو چھوٹی چھوٹی ''شیخ ریاستوں'' (Sheikhdoms) میں تقسیم کر کے ۔۔۔نوں کو سیاسی طور پر کھوکھلا کر دیا گیا۔

آج کے عالمی اُفق کے حالات بھی ہمارے سامنے ہیں۔دنیا میں ۔۔۔نوں کی تعداد ایک ارب بیس کروڑ سے زائد ہے اور اس اعتبار سے دنیا کا ہر پانچواں آدمی ۔۔۔ن ہے۔مزید برآں حالیہ اعداد وشمار

کے مطابق اسلام دنیا کا سب سے تیزی سے پھیلتا ہوا دین ہے۔لیکن اس کے باوجود ۔ییت نوں کی حالت یہ ہے کہ 2001ء میں افغانستان پر حملے کیلئے امریکہ نے مختلف مشرقی ومغربی ممالک کواس طرح دعوتِ شرکت دی جیسے کھانے پر بلایا جاتا ہے۔حملے میں شمولیت کی اس دعوت کوقبول کرنے کے صلے میں اُن ممالک کے خزانے بھر دیئے گئے۔56اسلامی ریاستوں کے کرۂ ارض پر وجود کے باوجود کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کوئی ’’صـلیبیت‘‘ کی اس یلغار کے خلاف آواز تک ہی اٹھا سکے۔ہاں البتہ کئی ۔ییت ن ممالک نے اس حملے کیلئے تمام ممکنہ سہولیات فراہم کیں اور خود خوب پیسہ بٹورا---یعنی’’اُلٹے بانس بریلی کو‘‘

۔ییت نوں کی عددی کثرت تمام قدرتی ذرائع اور دنیا کے اہم تجارتی راستوں کے مالک ہونے کے باوجود پانی پر بکھری کاٹھ کباڑ سے کچھ زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔تیل کی دولت سے مالامال عربی ممالک آج برادر اسلامی ممالک فلسطین، افغانستان اور عراق کو بچانے اور کمزور اسلامی ممالک کو مضبوط بنانے کی بجائے اپنے مغربی آقاؤں کوخوش کررہے ہیں۔مغرب کی پوری مشینری ۔ییت ن ممالک کے تیل پر چل رہی ہے۔1991ء کی خلیج کی جنگ لڑی ہی اسلئے گئی تھی کہ کویت اور سعودی عرب کے معدنی تیل کے ذخائر پر قبضہ جما کر آنے والے دس سے پندرہ سالوں کیلئے امریکہ ویورپ کے صنعتی نظام کوتحفظ فراہم کیا جا سکے۔عراق جس کے پاس دنیا کے دوسرے سب سے بڑے تیل کے ذخائر ہیں،کواُس وقت پابندیاں لگا کر محض اس لیے باقی دنیا سے کاٹ دیا گیا تھا کہ عراقی ذخائر سے فائدہ مستقبل قریب میں اُس وقت اُٹھایا جائے گا جب کویتی وسعودی تیل کے ذخائر میں بہت حد تک کمی واقع ہو چکی ہوگی۔خلیج کی جنگ سے 2003ء میں کیے گئے حملے تک عراق کو دنیا میں کہیں بھی تیل فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی۔اس معروضی صورتِ حال سے ۔ییت نوں کو یہ سمجھ آجانی چاہئے کہ مغرب کے کفریہ نظام کے اہداف کیا ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی صورت میں قائم بین الاقوامی ادارہ درحقیقت امریکی ومغربی مفادات کا پہرہ دار ہے۔اس کی نام نہاد غیر جانبداری دراصل ۔ییت نوں کا منہ بند رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا ایک حربہ ہے۔جبکہ اس کے برعکس اہلِ مغرب کیلئے استحصال اور ظلم روا رکھنے کے تمام دروازے کھلے ہیں، کیونکہ اقوامِ متحدہ مختلف حیلے بہانوں سے انہیں’’دنیا کی بہتری‘‘ کا جواز فراہم کرنے کی تگ ودو میں لگی رہتی ہے۔الغرض قربِ قیامت کی ایک بہت بڑی علامت پوری ہو چکی ہے۔اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تواس سے پہلے یہ علامت 1099ء میں پوری ہوتی ہوئی نظر آئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ۔ییت ن باہمی اختلافات اور

جنگ وجدل کی وجہ سے پہلی صلیبی جنگ ہار گئے تھے اور بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔لیکن آج کا عالمی اُفق اس بات کا شاہد ہے کہ یہ آج ہی کا بدترین دور ہے، جس کی آنحضرت ﷺ نے پیشگوئی کی تھی۔ مسلمانوں کی تمام تر عددی برتری اور وسائل کی ملکیت کے باوجود عقیدہ کی کمزوری اور مقصد پر یقین محکم نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا رُعب بےنور و بے برکت ہو چکا ہے۔ وہی عرب جو دولتِ ایمانی سے سرفراز ہو کر عددی قلت کے باوجود اپنے عہد کی سپر پاوروں ''روم وفارس'' کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے، آج وہی عرب اسرائیل جیسے چھوٹے سے ملک سے تین بار پٹ چکے ہیں۔ اسرائیل 1948ء، 1967ء اور 1976ء میں پوری عرب دنیا کے فوجی اتحاد کو ہرا کر ثابت کر چکا ہے کہ مسلمان اُس کیلئے تر نوالہ ہیں۔ اگر اسرائیل جیسا ملک مسلمانوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر رہا تو امریکہ، روس، چین اور متحدہ یورپ کے مقبل مسلم دنیا کا کیا حال ہوگا؟ یہاں جو منطقی سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہی حال رہے گا خدا کے آخری دین اور آخری اُمت کا؟ کیا آج سے بڑھ کر کوئی اور زمانہ ''قربِ قیامت'' کا وقت کہلوانے کا زیادہ حقدار ہے؟

ایک اور صحیح حدیث میں چند اہم علامات بڑے واضح انداز میں بیان کی گئی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک (مسلمانوں کی) دو بڑی جماعتیں آپس میں زبردست جنگ نہ کر لیں۔ اُن دونوں کا دعویٰ ایک ہی ہوگا (کہ دونوں حق کے لیے لڑ رہے ہیں)۔ جب تک تیس کے قریب ایسے دجال و کذاب نہ پیدا ہو جائیں، جن میں سے ہر کوئی خود کو خدا کا رسول بتائے گا (معاذ اللہ)''۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک نہ آئے گی، جب تک دنیا سے علم اٹھ نہ جائے اور زلزلوں کی کثرت نہ ہو جائے۔''

(متفق علیہ)

مذکورہ بالا حدیث میں جن دو بڑی جماعتوں کا ذکر موجود ہے، اُن کے بارے میں اکثر علماء اور مؤرخین کا خیال ہے کہ یہاں اشارہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے تنازع کی طرف ہے۔ تاہم اس سے بہتر اور سیاق سباق کے اعتبار سے زیادہ معتبر تشریح ماضی قریب کی صورتحال میں موجود ہے۔ ایران اور عراق کی جنگ جسے ''جنگِ خلیج اوّل'' (First Gulf War) کہتے ہیں اس حدیث کی بہترین ترجمانی کرتی

ہوئی نظر آتی ہے۔ایران وعراق جنگ تقریباً دس سال جاری رہی اوراس میں دونوں طرف سے دس لاکھ سے زائدلوگ مارے گئے ۔حیران کن امر یہ ہے کہ دونوں طرف ایک ہی خدااور رسولﷺ کے نعرے بلند ہو رہے تھےاور حق پر ہونے کا دعویٰ کیا جارہا تھا۔علاوہ ازیں اگر بات جھوٹے مدعیانِ نبوت کے حوالے سے کی جائے تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ علامت پوری طرح سے ظاہر ہوچکی ہے۔راقم الحروف کے مطابق ''تیس'' کا ہندسہ کثرتِ تعداد پر دلیل ہےاوراگر تاریخ کے اوراق کوکھول کر دیکھا جائے تو بات ڈھکی چھپی نہیں رہ جاتی کہ مسیلمہ کذاب سے شروع ہونے والی کہانی کا انجام مرزا پھیکان قادیانی کی جھوٹی نبوت پر بھی نہیں ہوا، بلکہ یہ داستانِ کذب بڑھتی ہی جارہی ہے۔حالیہ برسوں میں ایک ''یوسف'' نامی کذاب نے حضرت محمد ﷺ کا ''اوتار'' ہونے کا دعویٰ کیااور کہا کہ اس میں (معاذ اللہ) محمد ﷺ کی روح حلول کرگئی ہے۔یہ معاملہ کافی عرصہ تک میڈیا میں رہااور بعدازاں اُس شخص کوگرفتار کرلیا گیا۔

فرمانِ نبویؐ کے عین مطابق عصرِ حاضر میں علم سے برکت اُٹھ چکی ہےاورعلم بجائے عمل یا اصلاح کے،محض پیسہ کمانے کیلئے سیکھا اور سکھایا جارہا ہے۔اس نکتے پر کتاب کے ایک اور حصے میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے،لہٰذا اب مزید گفتگو کی گنجائش باقی نہیں بچتی۔علاوہ ازیں زلزلوں کی کثرت کے حوالے سے بھی کتاب کے دوسرے حصے میں اعداد وشمار دیئے گئے ہیں اور تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔تاہم قارئین سے بھی گزارش ہے کہ وہ ان دونوں امور پر بالخصوص اوراوپر والی حدیث میں بیان کردہ باقی دوعلامات پر بالعموم غور اورمزید مطالعہ کریں تاکہ اُن پر یہ واضح ہوجائے کہ قیامت کیلئے اب مزید کوئی لمبا ٹائم فریم دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

بے شک اس حقیقت سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ تقلیدِ مغرب بھی علاماتِ قیامت میں سے ایک اہم انتباہ ہے۔حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے انتہائی عام فہم اوردوٹوک انداز میں فرمایا:

''تم اپنے سے پہلوں کا ٹھیک ٹھیک بالشت ببالشت اور ذراع بذراع اتباع کروگے۔حتیٰ کہ وہ اگر گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے تھےتو تم بھی لازماً ہوگے۔سوال کیا گیا: یارسول اللہ ﷺ کیا پہلوں سے آپ کی مراد یہود ونصاریٰ ہیں؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: تو اورکون ہیں؟''

(متفق علیہ)

اس حدیث کے آخر میں آپ ﷺ نے تصدیق فرما دی کہ ''پہلوں'' سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ حضور ﷺ کے دور میں ''رُوم'' کا لفظ پورے عیسائی یورپ کو مخاطب کرنے کیلئے مستعمل تھا۔ جبکہ نصاریٰ یعنی عیسائیوں کی مطلق پہچان اُس دور میں سلطنتِ رُوم ہی سے تھی۔ یہاں یہود کی مذمت شریعتِ موسویؑ سے انحراف کی وجہ سے کی گئی۔ یہودی تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہو گا کہ آل یہود اپنے دین میں نت نئی اختراعات کرنے اور انبیاء سے دشمنی کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

پچھلی حدیث سے مماثل ایک اور حدیث میں ''رُوم و فارس'' کے اتباع کی بات بھی بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اُس وقت تک قیامت قائم نہ ہو گی، جب تک میری اُمت بالشت بالشت اور ذراع بذراع فارس اور رُوم کی اتباع کرنا شروع نہ کر دے۔''

(بخاری)

سترہویں صدی عیسوی میں اہلِ یورپ نے کلیسا کا سیاست سے اثر اور کردار بالکل ختم کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں ریاست و حکومت اور کلیسا و دینیات (یعنی مذہب) کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا گیا۔ اُس وقت سے آج تک اہلِ مغرب کی سرشت میں چھپی ہوئی بربریت و بے شرمی آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ افسوس اس امر پر ہے کہ جس اخلاقی پستی پر آج ملحد یورپ کھڑا ہے، ہم اُسی اخلاقی گراوٹ کو چمپئین زندگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہم ان معاشروں کے اندر مغربی طرز کا غیر مہذب لباس پہننا، داڑھی کے ایسے ایسے سٹائل بنانا جو اسلام تو درکنار، کسی بھی جمالیاتی حس رکھنے والے شخص کو نہ بھائیں، سرعام شراب نوشی کرنا، ناچ گانے میں لطف و سرور محسوس کرنا، مرد و زن کا شادی بیاہ اور دیگر محافل میں عام اختلاط ہونا وغیرہ اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ انہیں بنیادی ضروریاتِ زندگی سمجھا جانے لگا ہے۔ اور اگر کوئی بھی مشرقی یا مذہبی ذہن رکھنے والا شخص ان معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز اٹھائے تو اُسے دقیانوس اور قدامت پرست ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ ٹی وی چینلز پر نیم عریاں خواتین اسلام پر تبصرہ فرما کر اسے مادر پدر آزاد دین ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہوتی ہیں۔ کسی کو کچھ پرواہ نہیں کہ قرآن و سنت کیا کہتے ہیں۔ ہر کوئی اپنا راگ الاپنے میں مصروف ہے۔ اشرافیہ جس بات کو صحیح سمجھ لے، میڈیا اس کو حق بات ثابت کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ علماء دین کی باتوں کو سننے کی بجائے آج اُن کا تمسخر اُڑایا جاتا

ہے۔ایک ضداورانا ہے جو ہر شخص کے سر میں گھس گئی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور حدیث مبارکہ میں درج ہے:

''ہر شخص نفسانی خواہشات کی پیروی کرے گا اور اپنی رائے کو ترجیح دے گا اور اس پر اِتراتا ہوا نظر آئے گا۔''

(مشکوٰۃ)

آج ہر مرد اور عورت اپنی رائے کو یوں اہمیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے وہی عصرِ حاضر کے ''سقراط، افلاطون یا ارسطو'' ہوں۔ یہ کیفیت مادر پدر آزاد معاشروں میں اور بھی شدت اختیار کر کے ''خود پرستی''(Self-Centerism) کی بیماری کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ وہ نفسیاتی بیماری ہے جس کے باعث اکثر کسی بات کے ذرا سا برا لگنے پر خودکشی تک کا انتہائی قدم اُٹھالیا جاتا ہے۔الغرض پانی سر سے گزر چکا ہے۔90 فیصد سے زائد علامات پوری ہو چکی ہیں۔ باقی رہ جانے والی چند بڑی علامات پوری ہونے کے بہت قریب ہیں۔

سائنس اور قربِ قیامت

Science & Doomsday

دیگر تمام ذرائع کے ساتھ ساتھ جدید سائنس ایک ایسا ناقابل تردید ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم قربِ قیامت کے حوالے سے حاصل کردہ معلومات کو انتہائی باریک بینی سے پرکھ سکتے ہیں۔سائنس ہمیں ہر چیز کا مشاہدہ تجرباتی (Experimental) بنیادوں پر کرواتی ہے اور جب تک ہر چیز آنکھوں کے سامنے کھل کر نہ آجائے، اسے حقیقت تسلیم نہیں کیا جاتا۔ مذہبی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سائنسی نقطۂ نظر میں ''عین الیقین'' ہی ''حق الیقین'' ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''Seeing is Believing'' سائنس کا وہ قانون ہے جس کے بغیر سائنس از خود سائنس نہیں۔سائنس کا یہ چمنیو رانسان کو

توہم پرستی اور تخیل کی دنیا سے نکال کر حقائق کی طرف لے آتا ہے۔ جس سے انسان نے عقائد کو حقائق سے تب تک جدا رکھا، جب تک وہ ثابت نہیں ہوگئے۔

قربِ قیامت کے موضوع پر سائنسی تحقیقات نے جدید دور کے انسان کی جو مدد کی ہے، اس کی اہمیت سے انکار کسی صورت بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کے مختلف شعبہ جات نے نہ صرف مستقبل قریب میں ہونے والے واقعات کی پیش گوئیاں کی ہیں، بلکہ ان پیش گوئیوں اور تحقیقات سے حاصل شدہ حتمی معلومات کی روشنی میں ایک خاص دن کا تعین بھی کر دیا ہے۔ ایک ایسا دن جب وقت کی سوئی ہمیشہ کیلئے تھم جائیگی اور دنیا اپنے انجام سے دوچار ہو جائیگی۔ عالمِ انسانیت کیلئے یہ حقیقت جس قدر حیران کن ہے، اسی قدر خوفناک بھی ہے کہ دنیا 21 دسمبر 2012ء کو فنا ہو جائیگی۔ مذہبی، تاریخی اور دیگر شواہد کے ساتھ ساتھ اگر سائنس بھی 21 دسمبر 2012ء کے دن کی بطورِ قیامت تصدیق کر رہی ہے تو یقیناً اس حقیقت کا انکار بے جا اور لاحاصل ہے۔ اتنے بہت سارے ثبوت میسر آجانے کے بعد اگر محض چھوٹے چھوٹے نکات، جو بظاہر 21 دسمبر کے نظریے سے متصادم ہیں، کا سہارا لیکر دسمبر 2012ء میں آنیوالی خوفناک تباہی اور کرۂ ارض پر سے انسانی زندگی کے خاتمہ کی حقیقت کا انکار کر بھی دیا جائے تو یہ محض جھوٹی تسلی کے سوا کچھ نہیں، جو کہ دل کو کچھ دیر کیلئے خوشنما سراب کا شکار کر کے پرسکون کر دے گی۔

Polar Shift, Planet X, Glactic Enligmment, Web Bot Program ً
چند ایسے ناقابلِ فراموش حقائق ہیں، جن کی مدد سے قیامت کی گھنٹوں اور منٹوں کی حد تک واضح پیش گوئی کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ اس باب میں ہم ان تمام سائنسی عوامل پر ایک جائزہ پیش کریں گے، جو اس قدر صراحت کے ساتھ 21 دسمبر 2012ء کو زمینی زندگی کے خاتمے کا اعلان کر رہے ہیں کہ ان کو جھٹلانا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اس جائزہ کے بعد ہم یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑیں گے کہ وہ اس باب میں پیش کردہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے 21 دسمبر 2012ء کے نظریے سے کس قدر متفق ہوتے ہیں۔

نظامِ شمسی میں ایک ''نامعلوم وجود''

An "Unknown Object" in the Solar System

1970ء میں جب امریکی خلائی ادارے 'ناسا' (NASA) نے قدیم ماہرینِ فلکیات کے بیانات کی روشنی میں Planet X کا کمپیوٹر ماڈل تیار کیا تو اس وقت یہ سیارہ محض ایک تخیلاتی جسم کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن 1983ء میں ناسا کے 13 سالہ تحقیقاتی سفر کے بعد Planet X اچانک ایک فلکیاتی حقیقت بن کر ابھرا۔ 1983ء میں ناسا کے سائنسدانوں نے ''Infrared Astronomical Satellite'' جسے مختصراً ''IRAS'' کا نام دیا جاتا ہے، کی مدد سے ایک ''دیو قامت نامعلوم وجود'' کو دریافت کیا۔ مزید گہرائی سے مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ نامعلوم وجودِ سماوی، درحقیقت نظامِ شمسی ہی کا حصہ ہے، جو کہ ستاروں کے ''اورئین'' (Orion) نامی جھرمٹ کے رخ پر واقع ہے۔ یہ ایک حیران کر

دینے والا انکشاف تھا جس نے ناسا کے ایوانوں میں زلزلہ سا طاری کر دیا۔ امریکی میڈیا میں بھی اس انکشاف نے کھلبلی مچا دی اور امریکی اخبارات نے اس معاملے کو بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اٹھا لیا اور ناسا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ''دی واشنگٹن پوسٹ'' (The Washington Post) نے 30 دسمبر 1983ء کو یہ معروف شہ سرخی لگائی۔

"At Soler System's edge giant object is a mystery.....A heavenly bedy possibly as large as the giant planet Jupitar and possibly so close to the Earth that it would be a part of this Solar System has been found in the direction of the constellation "Orion" by an orbiting telescope called IRAS." [1]

''نظامِ شمسی کے کنارے پر ایک دیو قامت وجود کا پایا جانا انتہائی پر اسرار معاملہ ہے۔۔۔ یہ ایک ایسا سماوی جسم ہے جو کہ ممکنہ طور پر اس قدر بڑا ہو سکتا ہے جتنا کہ دیو قامت سیارہ مشتری ہے، جبکہ یہ زمین کے اس قدر قریب واقع ہے کہ ممکنہ طور پر ہمارے ہی نظامِ شمسی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک مداری دوربین IRAS نے ستاروں کے جھرمٹ ''اورئین'' کی طرف دریافت کیا۔''

اخبار کی طرف سے جب IRAS پراجیکٹ کے سب سے معروف سائنسدان گیری نیگ باؤر (Gerry Negbauer) سے سوال کیا گیا کہ ''یہ سماوی وجود حقیقت میں کیا چیز ہے؟'' تو گیری نے جواب دیا۔

"All I can tell you is that we don't know what it really is."

''میں جو کچھ بھی تمھیں بتا سکتا ہوں، وہ یہی ہے کہ ابھی ہم پوری طرح سے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

اور یہیں سے اِس پر اسرار کہانی کا آغاز ہوا۔ کچھ اور معروف اخباروں نے شہ سرخیاں لگائیں۔

"Giant Object Mystfies Astronomers."

"Mystery Body Found in Space!"

1. Washington Post, "Mystery Heavenly Body Discovered", 30-12-1980, p. A1

اس معاملے کو سر اٹھائے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ یہ کہانی اچانک منظرِ عام سے غائب کر دی گئی۔ ناسا نے حیران کن طور پر 'پراسرار' چپ سادھ کر اس موضوع کو یوں دبا دیا جیسے یہ واقعہ کبھی ہوا ہی نہ تھا اور تب سے آج تک اس موضوع پر امریکی خلائی تحقیقی ادارے کی طرف سے کوئی بات نہیں کی گئی۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ کیا اس کے پیچھے کوئی راز تھا؟ " اس واقعہ کے پیچھے کوئی ایسا بہت بڑا راز ہے، جسے امریکی حکومت چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ متشکک ذہن شاید اس واقعہ اور اس کے بعد پیدا ہونے والے حالات پر یقین نہ کریں۔ تاہم ہماری طرف سے ایسے لوگوں کو صرف اتنی گذارش ہے کہ وہ دسمبر 1983ء کے آخری ہفتے اور جنوری 1984ء کے معروف امریکی اخبارات اٹھا کر حقیقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ و ادراک کر لیں۔

کچھ ماہرین فلکیات کی طرف سے ایک اور اعتراض جو کہ حال ہی میں سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ امریکی حکومت کی معاونت سے خلائی ادارے ناسا نے قطب جنوبی (Southern Pole) میں ایک بہت طاقتور دوربین نصب کی ہے[1]۔ جبکہ اس دوربین کے ساتھ ایک انتہائی ترقی یافتہ مشاہدہ گاہ بھی تعمیر کی گئی ہے جس کا واحد مقصد ''نبیرو سیارہ''، جس کو "Planet X" بھی کہتے ہیں کے مدار کا جائزہ لینا اور اس کے زمین کی طرف بڑھنے کے خطرے سے پیشگی آگاہی حاصل کرنا ہے۔ تاکہ اگر سو (100%) میں سے پچیس (25%) فیصد بھی ٹکراؤ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو بروقت حفاظتی تدابیر کر کے انسانی زندگی کے بچاؤ کا کوئی راستہ نکالا جا سکے۔

یہاں پر ایک اور اہم سوال، جو کہ بہت سے ذہنوں میں سر اٹھا سکتا ہے، خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ سوال یہ ہے کہ Planet X جیسا بڑا سیارہ اگر واقعتاً زمین کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے جس سے Planet X اور سیارہ زمین کے تصادم کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا ہے، تو ایسی صورت میں زمین پر موجود انسانوں کو Planet X آسمان کی وسعت میں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دینا چاہیے تھا۔ " یہ سوال اپنی صحت کے اعتبار سے بہت مؤثر اور وزنی ہے۔ تاہم اس کا ایک جامع سائنسی جواب موجود ہے کہ زمین چونکہ

1۔ اس دوربین کو "South Pole Telescope" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا وجود اور استعمال NASA کے زیر استعمال دیگر دوربینوں کے برعکس انتہائی خفیہ رکھا گیا ہے۔

23.4 درجے پر جھک کر اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اس لیے ہم محض وہی اجسامِ فلکی دیکھ سکتے ہیں جو کہ قطب شمالی کے نصف کرہ کے آسمان پر ظاہر ہوں۔ قطب جنوبی انسانی زندگی کے آثار سے مکمل طور پر محروم ہے۔ اس لیے دنیا کے اس نصف کرے پر ہونے والے کسی حادثہ یا قطب جنوبی کے آسمان پر نظر آنے والی کسی بھی چیز کو دنیا کے باقی علاقوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ امریکہ کا قطب جنوبی میں طاقتور دوربین لگا کر فلکیاتی مشاہدہ گاہ قائم کرنا اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔

ایسے ماہرین فلکیات جو Planet X کی حقیقت سے واقف ہیں اور دنیا کو اس شدید نوعیت کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، کا کہنا ہے کہ یہ سیارہ زمین کی طرف بڑھتے ہوئے انسانی آبادی والے نصف کرہ سے بالکل نظر نہیں آئے گا۔ جبکہ اس کا ظہور اس وقت اچانک ہوگا جب یہ ٹکراؤ کے عمل اور وقت کے بہت قریب پہنچ چکا ہوگا۔ اکثر ماہرین فلکیات نہ صرف اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں بلکہ ریاضیاتی حسابات سے یہ ثابت بھی کر چکے ہیں کہ نبیرو سیارہ اور زمین میں ٹکراؤ کا یہ واقعہ 21 دسمبر 2012ء کو ہی پیش آئے گا۔ اگرچہ اکثر دوسرے ماہرین فلکیات نیرو سیارہ کے زمین سے تصادم کے لیے مقرر کردہ اس تاریخ یعنی 21 دسمبر 2012ء کو اس سطح پر اہمیت نہیں دے رہے، جس سطح پر ان کو ''کہکشانی قطار بندی'' (Galactic Alignment) نے پریشان کر رکھا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ عمل ہے جس کا تعلق زمین کے شمسی مدار سے ہے اور اس کا انکار کسی صورت بھی ممکن نہیں۔ تاہم راقم الحروف اس عملِ سماوی کا تذکرہ موجودہ موضوع پر سیر حاصل بحث ہو جانے کے بعد تفصیل سے کرے گا۔ اگر غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے قدرت ہر طرف سے انسان، سیارۂ زمین یا شاید پوری کائنات کی بساط لپیٹنے کا اہتمام کر رہی ہو۔

''اور قیامت کا آنا تو آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی قریب۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''

(سورہ النحل ۷۷:۱۶)

''وہ دن وہ ہوگا جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ لیں گے جیسے خطوط کا طومار لپیٹا جاتا ہے۔''

(سورۃ الانبیاء ۱۰۴:۲۱)

Planet X یا نبیرو سیارہ کا زمین سے ٹکرانا عین ممکن ہے کہ 21 دسمبر 2012ء کے دن ہی کو پیش

آئے اور اسی دن دوسرے تمام سماوی حادثات بھی ہوں۔ اس مقام پر Planet X کے حوالے سے ایک مذہبی تاویل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ ایک حدیث نبوی ﷺ میں یہ خبر واضح انداز میں دی گئی ہے کہ قیامت سے پہلے ایک روشن ستارہ ظاہر ہوگا۔ جبکہ مزید ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے ایک ستارہ زمین پر گرے گا، جس کے ٹکراؤ کی شدت کی وجہ سے بڑے بڑے چٹانی ٹکڑے شہابیوں کی مانند کرۂ ارض پر گر کر انسانوں کے سر کچل دیں گے[1]۔ عین ممکن ہے کہ یہ وہی ستارہ (سیارہ) ہو جس کی پیش گوئی حدیث میں کی گئی ہے۔ لہٰذا ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ ستارے کا زمین سے ٹکرانا ایک ناگزیر عمل ہے جو قیامت کے ظہور کے وقت ایک اچانک مگر شدید حادثہ کی صورت میں وقوع پذیر ہوگا۔ چونکہ یہ پوری کتاب قیامت کے 21 دسمبر 2012ء کے دن رونما ہونے پر ایک مدلل بحث ہے۔ اس لیے ہمیں نبیرو سیارہ اور قیامت کے ظہور کے باہمی تعلق کو ذہن میں رکھ کر نبیرو سیارہ یا Planet X کی واپسی کو درحقیقت یومِ قیامت کی منادی ہی سمجھنا چاہئے۔

اس بات میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ہر قدیم تہذیب، مذہبی کتاب اور کہانت کے تمام معروف مراکز قربِ قیامت میں زمین سے کسی نامعلوم ستارے کے ٹکرانے کے واقعہ کی یکساں خبر دیتے آئے ہیں۔ مزید برآں، جدید سائنس بھی آج اس امر کی شاہد ہے کہ مستقبل قریب میں ایک دیو قامت سیارہ ہماری زمین سے ٹکرانے جا رہا ہے اور اس تصادم سے زمین پاش پاش ہو جائیگی، گویا کہ پہاڑوں اور میدانوں کو یکساں کسی نادیدہ قوت نے اٹھا کر باہم پٹخ ڈالا ہو۔

''اور زمین اور پہاڑوں کو اکٹھے اٹھا کر ایک ہی بار پٹخ کر پاش پاش کر دیا جائیگا۔ پس اسی روز قیامت برپا ہو جائیگی۔'' (سورۃ الحاقہ ۶۹:۱۴)

عصر حاضر کے ایک معروف پاکستانی سمجھنا اور سائنسدان (میٹالرجسٹ) پروفیسر ڈاکٹر فضل

1۔ (الف) حجۃ اللہ العالمین، صفحہ 829۔ (ب) ترمذی، جلد دوّم، صفحہ 41

کریم کا زمین کے ساتھ کسی ضخیم سماوی جسم کے ٹکرانے کے بعد پیدا ہونے والی صورحال پر یہ تجزیہ ہے:

''اگر کوئی ضخیم سماوی جسم یعنی بہت بڑا شہابِ ثاقب زمین پر گرے تو زمین اپنے اندر محض گڑھا پیدا ہونے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ یہ بات ممکنات میں شامل ہے کہ زمین کی گردشی رفتار اپنے محور کے گرد تبدیل ہو جائے یا پھر زمین کسی نئے محور کے گرد گھومنا شروع کر دے۔ اگر چہ یہ تبدیلیاں اپنی نوعیت میں بہت معمولی یا متوقع تبدیلیوں کا چند فیصد ہیں۔ مگر اس کے اثرات ساری دنیا پر پڑیں گے۔ اگر چہ یہ تبدیلیاں چھوٹے پیمانے پر ہونگی، لیکن ان کی مقدار اُن تبدیلیوں سے کہیں زیادہ ہوگی، جن کی بنیاد زمینی ہے۔ مثلاً گلیشیرز کی شفٹ یا مدوجزر کی پیدائش وغیرہ۔ زمین کے ساتھ بڑے تصادموں (جیسا کہ پلینٹ ایکس کا تصادم ہو سکتا ہے) کے اثرات بہت شدید ہوں گے۔ اتنے شدید کہ جن کا موجودہ انسان پہلی بار تجربہ کرے گا۔ اور یہ ایٹمی دھماکوں سے بھی زیادہ شدید ہوں گے۔ زمین کا کسی اور محور کے گرد گھومنے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہماری فضا بدل جائے گی۔ سمندر اپنا رخ بدل لیں گے، آب و ہوا تبدیل ہو جائیگی اور نئی سطحاتِ سمندر پیدا ہو جائیں گی[1]۔''

زمین کی کہکشانی قطار بندی

(Galactic Alignment)

زمین کی کہکشانی قطار بندی کیا ہے؟ اس امر کی وضاحت ہم ایک معروف سائنسدان کی زبان سے کرواتے ہیں۔ ''جان میجر جینکنز'' (John Major Jenkins)، جو کہ معروف امریکی ماہر فلکیات ہیں اور سائنسی جریدے ''Mathematical Astronomy Moricls'' سے وابستہ ہیں، کہتے ہیں۔

"The Galactic Alignment is the alignment of December solstice sun with Galactic Equator. This alignment occurs as a result of the procession of

---

1۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم، کائنات اور اس کا انجام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں، مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، 2004، صفحہ 116

the equinoxes caused by earth wobbling."[1]

یعنی کہکشانی قطار بندی وہ عملِ قطار بندی ہے، جس میں 21 دسمبر 2012ء یعنی اس سال کے چھوٹے ترین دن کا سورج (December Solstice Sun) چھنکا وے کہکشاں (Milky Way Galaxy) کے خط استواء کے بالکل اوپر ہوگا۔ اور زمین اپنی مداری حرکت میں موجود گہرے جھکاؤ کے باعث 21 دسمبر 2012ء کو اس سطح پر پہنچ چکی ہوگی کہ کہکشانی خطِ استواء پر سورج اور چھنکا وے کہکشاں کے عین درمیان میں پھنس جائیگی۔ اس پھنساؤ کے عمل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اجسامِ سماوی کی یہ ترتیب سیارہ زمین کے لیے ایک پھندا ثابت ہوگی؟ پیشتر اس کے کہ ہم کسی سائنسی پیش گوئی کی طرف جائیں، بہتر ہوگا کہ اس پورے عمل کی سائنسی توجیہات کا ایک طائرانہ جائزہ لے لیا جائے۔

زمین کا مدار ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا، بلکہ زمین سورج کے گرد چکر لگانے کے عمل کے دوران ایک خاص قسم کے بیرونی لڑھکاؤ کا شکار ہو جاتی ہے، جو کہ الجبری پیمائش میں ہر 71.5 سالوں میں 1 درجہ کے برابر بنتا ہے۔ آسان زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمین ہر ساڑھے اکہتر سال کے بعد ایک درجہ اپنے مدار سے باہر کی طرف کھسک جاتی ہے اور یوں زمین کا اپنے مدار کو بدلنے کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

اس عمل کی بدولت کرۂ ارض کے دونوں نصف کرّوں پر موسموں میں بھی ایک لمبے عرصے کے بعد تبدیلی آ جاتی ہے۔ ہر 2160 سال کے عرصہ کے دوران زمین اتنے زاویے تک گھوم چکی ہوتی ہے کہ آسمان پر نظر آنے والے کئی ستارے انسان کی نگاہوں سے مکمل اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی مورخ نے 160 قبل مسیح کے لگ بھگ کسی سماوی جسم کے آسمان میں مقام کا تعین کیا ہو تو آج وہ سماوی جسم اس جگہ پر نہیں ہوگا۔ یوں زمین کے مدار میں تبدیلی کا یہ سفر چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سیارۂ زمین 24800 سال کا وقت اسی عمل میں گزار کر ایک ایسے مقام پر آ جاتا ہے جو کہ سورج اور ہماری کہکشاں کے مرکز کی عین سیدھ میں واقع ہے۔ کہکشاں کے اندر جو خاص سطحی پلیٹ فارم ہمارا نظامِ شمسی استعمال کرتا ہے، اس کو سائنسی

---

1. www.alignment2012.com

زبان میں Ecliptic Plane کہتے ہیں۔ اس سطح کے گرد ایک چکر مکمل کرنے کیلئے زمین کو

24800 سال کا وقت درکار ہوتا ہے۔ یعنی زمین اپنے لڑھکنے کے عمل کے دوران مختلف مقامات سے گزرتی ہے اور ان مقامات میں سے ایک اہم مقام ہماری کہکشاں کا خط استواء بھی ہے۔ چونکہ یہ دائروی چکر 24800 سالوں میں مکمل ہوتا ہے، اس لیے یہ امر بھی فطری ہے کہ زمین کہکشانی خط استواء سے ایک بار گزر کر دوبارہ اس مقام پر 24800 سالوں کے بعد ہی آئے گی۔

کہکشانی خط استواء پر سفر وہ مرحلہ ہے جس کے طے کرنے میں زمین کو 36 سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے اور اس دوران زمین سورج اور کہکشانی مرکز کے درمیان پھنسی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں اطراف سے شدید کھنچاؤ (Gravitational Pull) ہوتا ہے اور زمین کی ساخت میں وسیع پیمانے پر تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ بات چونکہ سائنسی اعتبار سے ناقابل تردید ہے کہ زمین ہر 24800 کے کہکشانی سائیکل کے دوران لازماً ایک بار ساختمانی تبدیلیوں سے گزرتی ہے، اس لیے ہمیں مستقبل قریب میں وقوع پذیر ہونے والی کہکشانی قطار بندی اور اس کے زمین پر نتائج کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہوگا۔

Geophysics کے ماہرین کے مطابق کہکشانی قطار بندی کے عمل کا سب سے گہرا اثر سیارۂ زمین کے ''قشر'' (Crust) پر پڑتا ہے۔ قشر ارض گیند نما زمین کے اوپر چڑھے ہوئے ''بیرونی خول'' کو کہتے ہیں، جس کی موٹائی مختلف جگہوں پر 10 سے 30 میل تک ہے۔ قشر ارض کی مثال ایک سیب کے چھلکے کی سی ہے جس کی بالکل پتلی سی چھیل ہوتی ہے اور اندر گودا کافی زیادہ ہوتا ہے۔ چھلکے کے گھومنے کے نتیجے میں یہ گودے والے حصہ سے الگ ہو جائے گا۔

اب ہم کہکشانی قطار بندی کے ممکنہ نتائج کی طرف چلتے ہیں۔ زمین کے اس لڑھکنے کے عمل میں جو بات خوفناک حقیقت کی طرح سامنے کھڑی ہماری توجہ کو اپنی جانب کھینچ رہی ہے، وہ 21 دسمبر 2012ء کو زمین کے 24800 سالہ سائیکل کا پورا ہو جانا اور اس کی کہکشانی قطار بندی ہونا یعنی کہکشاں کے خط استواء کے بالکل اوپر سفر کا آغاز کرنا ہے۔ اس عمل سے ایک بار پھر سیارۂ زمین پر ساختمانی تبدیلیوں کا قوی امکان ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق جو تبدیلی سب سے زیادہ متوقع ہے وہ سائنسی زبان میں ''Polar Shift'' کہلاتی ہے۔ ''پولر شفٹ'' زمین کے قشر کے گھومنے اور قطب شمالی اور قطب جنوبی کے اپنی اپنی جگہ کو چند گھنٹوں کے اندر بدل لینے کا نام ہے۔ 21 دسمبر 2012ء کو جب سورج طلوع ہوگا تو زمین دو انتہائی طاقتور مقناطیسی قوتوں (Magnetic Forces) کے درمیان پھنس چکی ہوگی، جس سے زمین کی قوت ثقل

بڑی حد تک نیوٹرل ہو جائے گی اور زمین اپنے قشر پر مکمل قابو نہیں رکھ سکے گی۔ قشرارض کے یوں بے قابو ہو جانے کی صورت میں جو تباہی کرۂ ارض پر وقوع پذیر ہوگی وہ ناقابل بیان ہے۔ اگر آج سے 24800 سال پہلے Homo Sapien نامی ہماری نوع سے تعلق رکھنے والا ذہین انسان زمین پر موجود تھا تو اُس نے کرۂ ارض پر واقع ہونے والی اُن شدید تبدیلیوں کا گہرائی سے مشاہدہ اور ادراک کیا ہوگا اور یقینی طور پر تباہی کے اُن مناظر کو اپنے لاشعور میں کہیں نہ کہیں محفوظ کر لیا ہوگا جن سے پچھلی کہکشانی قطار بندی کے دوران ہماری زمین گزری تھی۔ کرۂ ارض کے دونوں قطبوں (قطب شمالی اور قطب جنوبی) کی موجودہ پوزیشنیں بالکل وہی ہیں جو پچھلی کہکشانی قطار بندی کے عمل کے دوران سورج اور ہماری کہکشاں کے استوائی مرکز کے باہمی مقناطیسی کھنچاؤ کے باعث زمین پر وجود میں آئیں۔ دونوں قطبوں کے مقامات کی تبدیلی اور قشرارض کی حرکت کے بقول ماہرین ارضیات (Geologists) جو سب سے بھیانک نتائج سامنے آسکتے ہیں، ان میں شدید نوعیت کے زلزلوں کا مسلسل آنا، پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ جانا، سمندروں کا بپھر کر سونامیوں (Tsunamis) کو جنم دینا، ساحلی شہروں کا سمندروں میں غرق ہو جانا اور زمین کی آب و ہوا کا اچانک تبدیل ہو جانا وغیرہ شامل ہیں۔ شاید قربِ قیامت میں انہی شدید نوعیت کی تبدیلیوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن حکیم نے بھی کچھ تبدیلیوں کا تذکرہ بڑے فصیح الفاظ میں کیا ہے۔

''جس دن زمین اپنی موجودہ حالت سے بدل دی جائیگی۔''

(سورۃ ابراہیم،۱۴:۴۸)

''جب زمین شدید زلزلہ سے ہلا دی جائیگی اور زمین اپنے اندر کی چیزیں باہر نکال پھینکے گی۔''

(سورۃ الزلزال،۹۹:۱-۲)

''جب سمندر (سطح زمین پر) بہا دیئے جائیں گے۔''

(سورۃ الانفطار،۸۲:۳)

''اور جب سمندروں کو بھڑکا کر بلند کر دیا جائیگا۔''

(سورۃ التکویر،۸۱:۶)

سیارۂ زمین کا اپنے محور (Axis) کے گرد 23.4 درجے پر گھومنا دراصل وہ سب سے بنیادی عمل ہے جس کی بدولت زمین پر زندگی کا وجود قائم ہے۔ عرفِ عام میں یوں کہنا چاہئے کہ زمین کی اس خاص

زاویہ پر حرکت ہی کرۂ ارض پر حیاتیاتی نظام (Biosphere) کی اساس ہے۔زمین ایک عرصہ سے اس زاویئے پر محوری گردش کرتی چلی آرہی ہے۔تاہم کوئی ایسا حادثہ جس کی نوعیت سیارہ زمین کی قوتِ مزاحمت سے بھی زیادہ شدید ہو، اس محوری گردش کے زاویئے کو بدل کر نظامِ زندگی کو تہس نہس کر سکتا ہے۔محوری زاویئے میں تبدیلی کا سائنسی زبان میں مطلب ہے کہ زمین کی آب وہوا یکسر بدل جائے گی۔اوراس طرح زمین انتہائی ٹھنڈا یا گرم ہونے کی صورت میں نظام زندگی کو برقرار رکھنے سے قاصر ہو جائیگی۔

21دسمبر 2012ء کو جو واقعہ رونما ہونے والا ہے، اُس کی نوعیت ہمارے تصور سے بھی کہیں زیادہ شدید ہوسکتی ہے۔اس کے نتیجے میں عین ممکن ہے کہ زمین کا محور ہی بدل جائے یا پھر زمین کسی اور زاویئے اور رفتار سے اپنے محور کے گرد گردش شروع کر دے۔ چونکہ زمین 21دسمبر 2012ء کو Galactic Alignment کی وجہ سے دو ماوراء اور انتہائی طاقتور قوتوں کے درمیان جکڑی جائیگی، اس لیے اس کی محوری گردش کی رفتار میں کمی کا امکان بھی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی ایک طرف بھی کھنچاؤ (Gravitation) بڑھ گیا تو زمین کا محوری زاویہ اسی طرف جھک جائیگا اور ایک نیا زاویہ ترتیب پا جائیگا، جس کے باعث اچانک وہ ڈرامائی تبدیلیاں اور واقعات شروع ہو جائیں گے، جن کی تصویر کشی قرآن وحدیث میں پہلے ہی کر دی گئی ہے۔

ویب باٹ کمپیوٹر پروگرام اور 21دسمبر 2012ء

Web Bot Program & Doomsday 2012

''ویب باٹ پروجیکٹ'' (Web Bot Project) ایک انتہائی طاقتور کمپیوٹر پروگرام ہے، جس کو انٹرنیٹ کی مدد سے استعمال میں لایا جاتا ہے۔''تعین قیامت'' کے موضوع پر ہونے والی حالیہ تحقیقات میں معاصرین اس پروگرام کو بے حد اہمیت دے رہے ہیں، کیونکہ موجودہ موضوع پر سائنسی پیشرفت کی پیمائش کے لیے یہ پروگرام انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔ویب باٹ پروگرام 1990ء کی دہائی کے اواخر میں ڈیزائن کیا گیا تھا اور اس کی تخلیق کا بنیادی مقصد سٹاک مارکیٹ میں کاروباری رجحان کو دیکھتے

ہوئے ''مندی'' یا ''تیزی'' کی پیشین گوئی کرنا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ویب باٹ نے ابتداء ہی میں بڑی کامیابی کے ساتھ مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیے اور کئی موقعوں پر مندی کی پیشگی اطلاع دے کر سرمایہ داروں کو اربوں ڈالرز کے نقصان سے بچایا۔ ویب باٹ کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اگر کہا جائے کہ یہ پروگرام کمپیوٹر سائنس کا ایک عظیم معجزہ ہے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ ویب باٹ اب ایک ایسا Prophetic Program بن چکا ہے، جس کی معلومات کو نظر انداز یا رد نہیں کیا جا سکتا۔

ویب باٹ پروجیکٹ جس طریقے سے کام کرتا ہے، وہ بھی ایک سائنسی عجوبہ سے کم نہیں۔ ویب باٹ کی رسائی کسی بھی بے حد طاقتور ''سرچ انجن'' (Search Engine) کی طرح انٹرنیٹ کی انتہائی وسعتوں تک ہوتی ہے جو کہ ان ویب سپائڈرز (Web Spiders) کی بدولت ممکن ہوئی ہے، جن کو اس پروگرام کے بیرونی ریڈارز (Radars) کے طور پر ڈیزائن کیا گیا ہے۔ جب سٹاک مارکیٹ کے حوالے سے کسی موضوع کی وضاحت کیلئے کوئی لفظ اس کے سرچ بار (Search Bar) میں لکھا جاتا ہے تو یہ انٹرنیٹ پر موجود ۔۔۔ی مواد میں سے مطلوبہ لفظ کو ہر دستیاب حالت میں نکال لاتا ہے اور کمپیوٹر سکرین پر بمع ویب سائٹ ایڈریس اس کو ایک فہرست کی صورت میں ظاہر کر دیتا ہے۔ لفظوں کی تلاش کا یہ کھیل محض مطلوبہ لفظ پر ہی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ویب باٹ مطلوبہ لفظ سے آگے اور پیچھے چلنے والی تحریر کو بھی لا حاضر کرتا ہے۔ یہ تلاش اتنی تیز رفتار سے کی جاتی ہے کہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں لاکھوں الفاظ ڈھونڈ لیے جاتے ہیں، جبکہ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تلاش کنندہ اپنے مطلوبہ لفظ کو ہر زاویے سے اس سے اگلی اور پچھلی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھ سکتا ہے۔

ویب باٹ پروجیکٹ کے پیچھے جو حتمی تصور کارفرما ہے، اسے ماہرین یوں بیان کرتے ہیں۔

''کائنات اور اس کے تمام باسیوں کے ''۔۔۔ی لاشعور'' کے اندر ایسی رسائی حاصل کرنا جس سے نتائج میں غلطی کی گنجائش بہت کم ہو جائے۔''[1]

ویب باٹ تحقیقات کے سلسلے میں ایک اور عجیب بات جو کہ مشاہدہ میں آئی ہے اس پروگرام کا خود کار نظام ہے، جس کی بدولت ویب باٹ نے کسی زندہ انسان کی طرح از خود مختلف تصورات پیش کرنا شروع کر دیے ہیں۔ مثال کے طور پر ویب باٹ ماضی، حال اور مستقبل کو بلا تخصیص ایک ہی زمانہ سمجھ کر ''حتمی نقطہ'' (Tipping Point) کا تصور پیش کرتا ہے اور ویب باٹ کے مطابق یہ حتمی نقطہ کسی بڑی تبدیلی کی

علامت ہوتا ہے۔

2001ء میں ویب باٹ پروگرام کے آپریٹروں نے محسوس کیا کہ یہ پروگرام محض کاروباری نوعیت کی تحقیقات اور پیشگوئیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے امور کی تحقیق میں انتہائی مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔اس نئی جہت کی دریافت کے بعد جب ویب باٹ سے وسیع پیمانے پرکاروباری امور میں کام لیا گیا تو جوسب سے پہلی پیشگوئی سامنے آئی اس نے مطالعہ کاروں کو حیران وششدر کر کے رکھ دیا۔یہ پیشگوئی جون 2001ء میں سامنے آئی اوراس میں جومعلومات بہم پہنچائی گئیں ان کے مطابق اگلے 60 سے 90 دنوں میں ایک بہت بڑاواقعہ ہونے جارہا تھا،جس کے اثرات عالمگیر سطح پرمحسوس کیے جانیوالے تھےاوراس کے نتیجے میں پوری دنیاایک گہری تبدیلی سے گزرنے والی تھی۔اس پیشگوئی کواگرچہ ابتداء میں صحیح توجہ اور پذیرائی نہ ملی۔لیکن 11 ستمبر کے پراسرار والمناک حادثے کے بعداس نے ساری دنیا کے ماہرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ ٹ ٹ یہ 11 ستمبر 2001ء کو پے درپے پیش آنے والے واقعات ہی تھے،جن کے حوالے سے موجود معلومات کو ویب باٹ نے ایک جگہ اکٹھا کر کے دنیا کو پیشگی خبردار کر دیا تھا۔آج ماہرین اسی پیشگوئی کا حوالہ دیکر ویب باٹ کی اغلاط سے پاک کارکردگی کی تعریف کرتے ہیں اور مستقبل کے واقعات کی پیشگی معلومات کیلئے ویب باٹ پرانحصارکوناگزیرقراردیتے ہیں۔ ایک معروف تحقیقی جریدہ ویب باٹ پروگرام کی ماضی کی کارکردگی کے حوالے سے یوں لکھتا ہے:

"One of the first accurate predictions from the Web Bot Program took place in June of 2001. The program predicted that a life altering event would take place within the next 60 to 90 days; an occurrence of such proportion that its effects would be felt worldwide."[1]

مزید برآں،ویب باٹ اپنی پیشگوئیوں میں محض انسانی واقعات تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اس نے قدرتی آفات کوبھی زیربحث لانا شروع کردیا۔ویب باٹ نے 2004ء میں حیرت انگیز طور پرسونامی کی پیشگوئی کی،جوحرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔اسی طرح اکتوبر 2005ء کے پاکستانی زلزلے اور امریکی

---

1. www.faggo.com

قطرینہ طوفان کی پیشگی معلومات بھی ویب باٹ سے حاصل کی گئیں۔ان معلومات کی روشنی میں امریکی ماہرین نے پاکستان کو قبل از وقت ایک طاقتور زلزلے کی خبر دے دی تھی، تاہم پاکستانی حکام کی طرف سے اسے سنجیدگی سے نہ لیا گیا۔2008ء کے عالمی معاشی بحران کی پیشگی اطلاع ویب باٹ 2007ء میں ہی دے چکا تھا اور ویب باٹ کی رپورٹ کے مطابق اس بحران کا اثر نہ صرف ہر معاشی سطح پر محسوس کیا جائے گا بلکہ بڑے مضبوط بینک دیوالیہ ہو جائیں گے اور ہر ملک میں بیروزگاری کی شرح انتہا کو پہنچ جائیگی۔یہ ویب باٹ کی ان بہت سی پیشگوئیوں میں سے محض چند ہیں، جنہیں وقت نے بالکل صحیح ثابت کیا اور ان کو کمپیوٹر ریکارڈز میں دیکھا بھی جا سکتا ہے۔

یہاں تک ہمارا موضوع ویب باٹ پروگرام کے ماضی کی کارکردگی پر روشنی ڈالنا تھا۔اب ہم ایک نظر اُن پیشگوئیوں پر ڈالتے ہیں، جو کہ ویب باٹ نے مستقبل کے چند سالوں کے حوالے سے کی ہیں۔

ویب باٹ کے مطابق 2009ء کے آخر میں یا 2010ء کے وسط تک دنیا کی سیاسی آب و ہوا اچانک جنگی ہو جانے کا امکان ہے، جس کی ممکنہ وجہ اسرائیل۔ایران تنازعہ ہو سکتا ہے۔عین ممکن ہے کہ اسرائیل اس جنگی مہم میں ایٹمی ہتھیار بھی استعمال کرے۔جس کے باعث ایٹمی تابکاری نکل کر جنوبی ایشیا (بالخصوص پاکستان اور افغانستان) کی آب و ہوا کو متاثر کرے۔اسی طرح ویب باٹ کی ایک اور پیشگوئی میں کہا گیا ہے کہ 2010ء ''ڈالر کی موت'' (Death of Dollar) کا سال ہے اور اس عمل کی ابتداء پہلے ہی اگست 2009ء سے ہو چکی ہے۔مزید برآں 2010ء انتہائی مہنگائی کا سال ہوگا اور یہ مہنگائی جو کہ ڈالر کی بے قدری کے باعث ظاہر ہوگی، خوراک کی قلت اور معاشی عدم استحکام کو جنم دے گی۔2011ء میں سمندروں میں شدید مدوجزر پیدا ہونے کا امکان ہے۔اس صورتحال کو Global Coastal Phenomena کا نام دیا جاتا ہے۔اس عملِ مدوجزر کے نتیجے میں ساحلی شہروں کے باشندوں کو شدید نوعیت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔2011ء ہی میں سورج کی الٹراوائلٹ شعاعوں (Solar Ultraviolet Rays) کی وجہ سے، جو کہ سورج پر پیدا ہونے والے کسی شدید طوفان کا نتیجہ ہو سکتی

1. Mary Joah, www.faggo.com

ہیں، زمین پر فصلیں شدید متاثر ہوں گی۔ ناسا (NASA) بھی ایسے شمسی طوفان (Solar Flare) کی 2011ء کے آخر یا 2012ء کی ابتداء میں وقوع پذیر ہونے کی پیشگوئی کر چکا ہے۔ اس شمسی طوفان کی وجہ سے جو شعاعیں زمین پر پڑیں گی، ان کا سب سے زیادہ نقصان گندم کی فصل کو ہوگا۔ علاوہ ازیں، ان زہریلی شعاؤں کے باعث اوزون (Ozone) کی تہہ اور زمین کی مدافعتی جیکٹ کے شدید متاثر ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔

اب تک کی تحقیقات میں سب سے تشویشناک بات جو ویب باٹ پروجیکٹ کے بارے میں سامنے آئی ہے، وہ ویب باٹ پروگرام کا 2012ء پر جا کر اچانک پیشگوئیوں کا سلسلہ ختم کر دینا ہے۔ سائنسدان ویب باٹ کے اس حیران کن سکوت سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ ویب باٹ کے زمانی شعور کے اندر 2012ء میں وقت کے وجود کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ویب باٹ اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ 2012ء کا سال کرۂ ارض پر انسانی حیات کے انجام کا سال ہوگا۔ اگرچہ اس معاملے میں یہ پروگرام تا حال کسی حتمی تاریخ کی نشاندہی نہیں کر سکا۔ تاہم "End of Time" کے چھینو کا اندازہ کیا جا چکا ہے اور وہ مہینہ دسمبر کا ہی ہوگا۔ جس مخصوص واقعہ پر ویب باٹ دنیا کا خاتمہ کرتا ہوا نظر آتا ہے اسے اس نے ''عالمگیر تباہی'' (Global Calamity) کا نام دیا ہے۔ یہ تباہی دل دہلا دینے والی ہوگی اور انسان نے ایسے تباہ کن مناظر پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ ویب باٹ کا انسان کے اجتماعی لاشعور کے اندر کا یہ مشاہدہ ایک مافوق الفطرت قوت کی طرف سے دیئے گئے الہامات کی طرح انسانی مستقبل کے دل دہلا دینے والے واقعات کی نشاندہی وقت کے صحیح تعین کے ساتھ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ معاملہ بھی انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ویب باٹ جیسے کمپیوٹر پروگرام نے-- جو کہ حسیات (Senses) جیسی انسانی صفت سے بھی محروم ہے-- اچانک 2012ء پر اپنی پیشگوئیاں کیونکر ختم کر دیں؟ کیا اس پروگرام نے کائنات کے اجتماعی لاشعور کے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ قدرت اب دنیا و مافیہا کی بساط لپیٹنے کے قریب ہے؟ اگرچہ ویب باٹ نے دن کا تعیّن نہیں کیا، لیکن اس بات کی اہمیت اس لیے بھی ختم ہو جاتی ہے کہ ''عالمگیر تباہی'' کا مہینہ دسمبر ہے۔ جس کے بارے میں پہلے ہی اتنی زیادہ معلومات اکٹھی کی جا چکی ہیں کہ معاملہ کی صحت پر شک کرنا ناممکن ہے۔ 21 دسمبر کی باقی تمام ذرائع سے بطور یومِ آفات و حادثات تصدیق ہو چکی ہے اور یقینی طور پر یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے کہ یہی دن عہدِ قیامت کے سلسلہ وار واقعات کی ابتداء ہے۔ چونکہ

سائنسدان اب ویب باٹ کا استعمال اس خاص مظہر پر توجہ مرکوز کر کے کر رہے ہیں، اس لیے عین ممکن ہے کہ عنقریب دسمبر 2012ء کی 21 تاریخ کی انفرادی حیثیت کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہو جائیں اور کچھ ایسے راز کھلیں جو عالمِ انسانیت کو چونکا کر رکھ دیں۔ ویب باٹ جیسے مستند کمپیوٹر پروگرام اور دیگر تمام معتبر ذرائع سے حاصل شدہ معلومات کا باریک بینی سے مطالعہ ہمیں مستقبل کے کئی حادثات کے بارے میں قبل از وقت خبردار کر سکتا ہے، جس کی بدولت ہم ایسے حادثات کا سامنا کرنے کیلئے کم از کم ذہنی طور پر تیار ہو سکتے ہیں۔ معلومات کی وسیع پیمانے پر دستیابی اور حالات کے اس حد تک معروضی شکل اختیار کر لینے کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم کائنات کے واحد حاکم اور یوم الحساب کے مالک سے ٹوٹے ہوئے تمام رابطے بحال کر کے ''عافیت و مغفرت'' کی دعا مانگیں۔

''کھڑکھڑانے والی چیز۔ کھڑکھڑانے والی چیز کیا ہے؟ اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ شدید کھڑکھڑانے والی چیز کیا ہے؟ یہ چیز (درحقیقت) وہ دن ہے، جب لوگ پروانوں طرح دیوانہ وار بھاگتے پھریں گے اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رنگین اُون کی طرح کر دیئے جائیں گے۔''

(القارعہ، ۱-۵:۱۰۱)

قدیم تہذیبوں میں تصورِ قیامت اور وقت کا خاتمہ

End of Time According to Ancient Civilization

دنیا کی حتمی تباہی کا تصور اس قدر معروف ہے کہ زمانۂ قبل از تاریخ سے لے کر آج تک تقریباً ہر تمدن اور تہذیب میں اس کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ قدیم تہذیبوں میں ہمیں ایسے قصے کہانیاں اور اساطیر ہر جگہ ملتے ہیں، جن میں زمین اور آسمان کی تخلیق اور اُن کی اُخروی تباہی پر بہت تفصیل سے بحث موجود ہوتی ہے۔ عراق کی ''سومیری تہذیب'' دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہے، جس نے آئندہ دور میں پنپنے والی انسانی فکر کو بنیادیں فراہم کیں۔ انہی لوگوں کی تحریر کردہ قدیم عراقی اساطیر (Mesopotamian

Mythology)''اینوما ایلش'' (Enuma Elish) میں بھی کچھ اسی قسم کے تذکرے ملتے ہیں جو تخلیقِ کائنات کے متعلق ہیں اور جن میں مافوق الفطرت قوتوں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زمین کی تخلیق' جیسا کہ اینوما ایلش اساطیر بیان کرتی ہے' مافوق الفطرت قوتوں نے کی اور یہ تخلیق کسی منصوبہ بندی کی بجائے دیوتاؤں کی لڑائی کا نتیجہ تھی۔ طاقتور ''مردوک دیوتا'' (Marduk God) کی لڑائی طاقتور دیوی ''تیامت'' (Tiamat Goddess) سے ہوئی، جس میں تیامت دیوی ہار گئی اور مردوک نے اُسے قتل کر دیا۔ آخر میں مردوک نے تیامت کی لاش کے دو حصے کیے اور ایک حصے سے آسمان بنایا اور دوسرے حصے سے زمین بنائی[1]۔ یہیں سے ہم زمین کیلئے ''مونث'' صیغہ کے استعمال کی ابتدا پاتے ہیں جس کے باعث تمام زمانوں کے لوگ زمین کو ہمیشہ ''ماں'' کے نام سے موسوم کرتے آئے ہیں۔

Enuma Elish کی مذکورہ بالا کہانی کو بیان کرنے کا مقصد قارئین پر محض یہ واضح کرنا تھا کہ قدیم زمانے کے لوگ بھی تخلیق کائنات، انسانی تخلیق اور کائنات کی موت کے موضوعات پر بڑی شدومد سے بحث کیا کرتے تھے۔ اُن کی ابحاث ہرگز بے معنی و بے نتیجہ نہیں تھیں، جیسا کہ آج کے جدید قاری کو کسی بھی قدیم فکر سے خدشہ لاحق ہوسکتا ہے۔ بلکہ یہ ابحاث کبھی کبھی کائنات کے ایسے رازوں پر سے پردہ اُٹھا دیا کرتی تھیں جو جدید انسان کو حیران و ششدر کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ وقت کے تصور سے لیکر فلکیات، ریاضیات، طبعیات اور بے شمار دوسرے علوم میں قدیم انسان کا علم انتہائی مضبوط تھا۔ اہرام مصر اور دیوار چین کی تعمیر قدیم انجینئرنگ کے منہ بولتے شاہکار ہیں، جنہیں دیکھ کر آج کا انسان بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ لوہے کی دریافت سے بہت پہلے کانسی کے دور (Bronz Age) کا انسان موزوں اوزاروں کے بغیر اتنی عظیم تعمیرات کرنے میں کیسے کامیاب ہوا۔ اس دور کے انسان کے پاس کچھ ایسی توانائی (Technology) اور تکنیکیں (Techniques) تھیں، جو انتہائی ترقی یافتہ شکل اختیار کر چکی تھیں۔ تاہم وہ تکنیکی مہارتیں ہم سے پس پردہ ہی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سارے ماہرین ان تعمیرات میں انسانی ہاتھ کے کارفرما ہونے کا صریحاً انکار کر دیتے ہیں اور ان کو کسی خلائی مخلوق (Aliens) کا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ تاہم ہمارا موجودہ موضوع ان تعمیرات کا کھوج لگانا نہیں، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ قدیم

1. Armstrong, Karen, A History of God, New York: Ballantine Books, 2002, pp. 10-11

تہذیبوں کی علمی حیثیت کیا تھی اور وہ لوگ کون کون سے ہنر جانتے تھے۔

تصورِ قیامت کے حوالے سے علم فلکیات کا شعبہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ظہورِ قیامت کا براہِ راست تعلق آسمان کے ساتھ ہے۔

''جب آسمان پھٹ جائیں گے۔اور (پھر) جب قبریں اکھاڑی جائیں گی۔''

(سورۃ الانفطار، ۱۔۴: ۸۲)

علم فلکیات کی بنیاد اُسی دن رکھ دی گئی تھی جس دن انسان نے پہلی بار آسمان کی وسعتوں کو حیرانی اور تجسس سے دیکھا ہوگا اور سوچ و بچار میں پڑ کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا ہوگا کہ یہ سارا ماجرا کیا ہے؟ زمانۂ قدیم میں تہذیب کی ترویج کے ساتھ ہی انسان کی دلچسپی آسمان، ستاروں، چاند اور سورج جیسے مظاہرِ قدرت میں بڑھ گئی۔ تحقیقی اذہان نے جہاں ایک طرف اُن کے ''فنکشن'' کو سمجھنا چاہا تو وہیں توہم پرست ذہنوں نے انہیں دیوتا قرار دے ڈالا۔ توہم پرست مکتبۂ فکر کے مدمقابل ہمیشہ ہی سے ایک تحقیقی مکتبۂ فکر رہا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے علم وآگہی اور جستجو کی انسانی زندگی میں اہمیت وضرورت پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُن لوگوں کو اوّلین فلسفیوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔

یہ اُن فلسفیوں کا ہی علم سے لگاؤ تھا کہ انسان ''وقت'' (Time) کے تصور سے واقف ہوا۔ انسان نے پھر دن، ہفتے، مہینے اور سال کی تخصیص کی۔ فطرت کے نظام کو پوری طرح سمجھ کر انسان نے قمری اور شمسی سالوں کا تقویمی نظام (Calendrical System) تشکیل دیا۔ قدیم مصر کے باسی وہ قدیم ترین لوگ تھے جنہوں نے سال کو 12 ماہ اور 365 دنوں میں تقسیم کیا۔ اس نظام کو بعد میں بابلیوں (Babylonians) نے بھی اپنایا۔ اور یوں یہ نظام ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کو منتقل ہوتے ہوتے آج اپنی موجودہ شکل پر پہنچ چکا ہے۔ تاہم اس نظام کی دریافت کے ساتھ کچھ حیران کن باتیں بھی وابستہ ہیں۔ جیسے سورج گرہن، چاند گرہن، دُم دار ستاروں کا ظہور یا ایسی ہی کسی اور آفاقی حرکت کا ظہور۔ یہ غیر معمولی آفاقی حرکات شروع سے ہی انسان کیلئے پریشان کن رہی ہیں۔ اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کیلئے جب انسان نے ان کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو اُس پر پراسرار راز سمجھی جانے والی یہ باتیں سلسلہ وار انداز میں کھلنے لگیں کہ یہ سب عوامل ''فطرت'' (Nature) کا حصہ ہیں اور ان کا ظہور کائنات کے خودکار نظام کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ اس نہج پر پہنچ جانے کے بعد انسان نے ایسے غیر معمولی عوامل اور

مظاہر قدرت کا مطالعہ تشکیکی بنیادوں پر بہت نزدیک سے کرنا شروع کر دیا جس کی بدولت بیشمار سائنسی انکشافات ہوئے اور انسان بالآخر اس قابل ہو گیا کہ مظاہر قدرت اور مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے فلکی حادثات وحرکات کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیشگوئی کر سکے۔ پیشگوئی کرنے کی صلاحیت کا حصول درحقیقت انسان کی آفاق اور اجرام فلکی کی تسخیر تھی۔ وہ اب مستقبل کو بہت پہلے جان سکتا تھا اور یہ بتا سکتا تھا کہ مستقبل کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور آسمان کون کون سے رنگ دکھائے گا۔

یہی فلکیاتی پیشگوئیاں ہمارے موجودہ باب کا موضوع ہیں۔

عام زندگی میں کسی پیشگوئی کا پورا ہونا کشف یا روحانی علوم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ تاہم فلکیاتی پیشگوئیوں کا سچ ثابت ہونا سائنسی علم کی پختگی کی علامت ہے۔ اس باب میں ہم دو قدیم تہذیبوں کے علم فلکیات سے فائدہ اٹھا کر اُن کے تقویمی نظاموں میں متعارف کروائے گئے ''اینڈ آف ٹائم'' یعنی وقت کے اختتام اور قیامت کے ظہور کا تعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

میکسیکو کی مایا تہذیب

Maya Civilization of Maxico

اس باب میں ہمارا پہلا موضوع مایا تہذیب ہے۔ جسے ماہرین آثار قدیمہ ''وسطی امریکی تہذیب'' (Mesoamerican Civilization) کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ مایا تہذیب کا دور چھٹی سے گیارہویں صدی عیسوی تک رہا جس کے دوران یہ تہذیب میکسیکو کے پہاڑی سلسلوں میں پھلتی پھولتی رہی۔ مایا تہذیب کی باقی تمام خصوصیات اپنی جگہ، تاہم ہمارا موضوعِ بحث جو خاص نکتہ ہے وہ مایا تہذیب کا انتہائی ترقی یافتہ ''کیلنڈر سسٹم'' ہے۔ اس پُر پیچ تقسیمِ وقت کو ''باکٹن'' (Baktun) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مایا کیلنڈر کا کل دورانیہ پانچ ہزار ایک سو پچیس (5125) سال پر مشتمل ہے، جسے تیرہ حصوں یا

باکٹنوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ان تیرہ میں سے ہر حصہ یا باکٹن ایک لاکھ چوالیس ہزار 1,44,000 دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مایا لوگوں کے کیلنڈر کی ابتداء گیارہ اگست 3114 قبل مسیح سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے کیلنڈر کو انسانی تاریخ میں اس قدر پیچھے لے جانے کیلئے علم فلکیات بالخصوص اجرام فلکی کی حرکت کا سہارا لیتے ہیں اور وقت کو اپنے وجود سے بھی کم وبیش ساڑھے تین ہزار سال تک پیچھے پھیلا دیتے ہیں۔ اگرچہ اس سارے معاملے میں ثقیل ریاضی کے سوا بظاہر کچھ نظر نہیں آرہا، تاہم اس تقویمی نظام کی جو بات ہمارے لئے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے-- بلکہ حیران کن ہے-- وہ مایا لوگوں کی طرف سے کی گئی آنے والے ایک ہزار سال تک کی سورج اور چاند گرہن کی پیشگوئیاں ہیں جو حرف بحرف اور لمحہ بہ لمحہ سچ ثابت ہوئیں ہیں۔ مزید برآں جو دوسرا حیرت انگیز امر سامنے آیا ہے وہ مایا کیلنڈر میں لیپ کا سال نہ ہونے کے باوجود موجودہ عیسوی کیلنڈر (Gregorian Calendar) اور مایا کیلنڈر میں ایک دن تک کا فرق بھی نہ آنا ہے۔ یہ مایا تہذیب کی فلکیاتی ترقی کے وہ آثار ہیں، جنہیں عصر حاضر کی ترقی یافتہ سائنس مصدقہ قرار دے چکی ہے۔ اپنی اِنہی تاریخی اور سائنسی خصوصیات کی بدولت مایا تہذیب کا فلکیاتی نظام اور کیلنڈر سسٹم قدیم تقویمی نظاموں کے اندر نہ صرف خاص مقام رکھتے ہیں، بلکہ آج بھی انتہائی مستند قرار دیئے جاتے ہیں۔

مایا تہذیب کے سائنسی نظام کی اس قدر وضاحت کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مایا کیلنڈر ہمارے لئے کیوں اہمیت کا حامل ہے۔ جو بات مایا تہذیب کا مطالعہ کرنے والے ماہرین آثار قدیمہ اور بہت سے سائنسی حلقوں کو پریشان کر رہی ہے وہ مایا کیلنڈر کا 21 دسمبر 2012ء کی تاریخ پر اچانک، مگر انتہائی پر اسرار انداز میں ختم ہوجانا ہے۔

مایا تہذیب کے کیلنڈر کے مطالعہ سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ مایا کیلنڈر سسٹم کا تیرھواں اور آخری باکٹن، جو کہ ابھی چل رہا ہے، 2012ء کی ''Winter Solistice'' (21 دسمبر جو کہ سال کا سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے انگریزی میں Winter Solistice کہلاتا ہے) پر ختم ہوجاتا ہے۔ یاد رہے کہ اکیس دسمبر سال کا مختصر ترین دن ہوتا ہے اور اس دن سورج زمین سے اپنے بعید ترین مقام پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں اکثر تقویمی نظام اکیس جون یا اکیس دسمبر سے شروع ہوتے یا ان پر ختم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ 21 جون سال کا طویل ترین دن ہوتا ہے اور اس دن سورج کا زمین سے فاصلہ کم ترین ہوتا ہے۔ مایا تقویم کے تیرہویں باکٹن کے اختتام پر جو تاریخ ظاہر ہوگی اسے مایا تحریروں میں یوں لکھا گیا ہے

13.0.0.0.0۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ تاریخ مایا لوگوں کے مطابق زمین کی تباہی کا وقت ہے۔ ہم آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مایا تہذیب کے ماہرین فلکیات کچھ مخصوص فلکیاتی مظاہر کی وجہ سے جس تاریخ کو دنیا کی تباہی کا دن قرار دے رہے ہیں، وہ رائج الوقت عیسوی کیلنڈر میں 21 دسمبر 2012ء بنتی ہے۔ اس دن دو پہر کو وقت کا پہیہ پیچھے گھوم جائے گا اور وقت پھر سے ''صفر'' ہو جائے گا۔ مایا لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ وقت کے دوبارہ صفر ہوتے ہی دنیا اپنے اختتام پر پہنچ جائے گی اور عالمِ رنگ و بُو مطلق موت سے دوچار ہو جائے گا۔

مایا تہذیب کی تقویم اور جنتری کے نظام کو آج اتنی اہمیت کیوں دی جارہی ہے؟ عصر حاضر کے سائنسدانوں میں مایا تہذیب کے حوالے سے دلچسپی کئی وجوہات کی بنا پر بڑھتی جا رہی ہے۔ جہاں سائنسدان پیچیدہ مایا تقویم اور اغلاط سے پاک فلکیاتی پیشگوئیوں کی وجہ سے حیران ہیں، وہیں وہ اس بات پر بھی ششدر ہیں کہ مایا لوگوں نے کس طرح بیک وقت تین کیلنڈروں کے کثیر جہتی نظام کو بیک وقت تخلیق کیا اور طویل عرصہ تک اس سے استفادہ کرتے رہے؟ یہ تین کیلنڈر بالترتیب 260، 360 اور 584 دنوں پر مشتمل تھے۔ ماہرین ریاضیات کے مطابق اتنا عمدہ اور پیچیدہ تقویمی نظام انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ عام قارئین کو شاید اس معاملہ کی قابلِ تعریف پیچیدگی عام فہم نہ لگے، لیکن وہ لوگ جو علمِ فلکیات، ریاضی یا امورِ طبیعات کی تھوڑی سی بھی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ راقم الحروف کن عوامل کو پردۂ لاعلمی سے باہر لا کر نوشتہ دیوار بنانا چاہ رہا ہے۔ بہر حال سائنسدانوں کی طرف سے کی گئی یہ تعریف اس بات کی دلیل ہے کہ مایا تہذیب کے پورے تقویمی نظام کے 21 دسمبر 2012ء کے دن پر اچانک ختم ہو جانے کو آج انتہائی سنجیدگی سے لیا جا رہا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کونسا ایسا فلکیاتی حادثہ ہو گا جس کے باعث سیارۂ زمین کے وجود تک کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی ستارہ، سیارہ یا شہابیہ زمین سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کر دے گا؟-- یا نظامِ شمسی کے حدود اربعہ میں کسی شدید نوعیت کی تبدیلی کا امکان ہے؟ یا پھر ہماری کہکشاں کوئی حیرت انگیز اثر پیدا کرنے والی ہے؟ یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے، جس کا جواب جدید سائنس ہر زاویئے سے دینے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ تاہم اس

موضوع پر مزید بحث سائنس کے تحت لکھے گئے باب میں کی جائیگی۔

سومیری تہذیب اور 21 دسمبر 2012ء

Sumerian Civilization & Doomsday 2012

قدیم عراق جسے اہل یونان نے اپنے دورِ عروج میں میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) کے نام سے موسوم کیا تھا، انسانی تاریخ کی پہلی ''حقیقی تہذیب''(Certified Civilization) کو جنم دینے کا اعزاز رکھتا ہے۔ لفظ Mesopotamia سے مراد ہے ''ایسی جگہ جو دو دریاؤں کے درمیان ہو۔''(Meso بمعنیٰ 'درمیان' اور Potamia بمعنیٰ 'دو دریا')۔ یہ دو دریا عراق کے معروف دریائے دجلہ اور دریائے فرات ہیں، جو زمانہ قدیم سے انسانی آبادی کے لئے خوراک وزراعت کا اہتمام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ زمانہ قبل از تاریخ میں جن لوگوں نے سب سے پہلے اس خطہ میں آبادکاری کی انہوں نے دجلہ وفرات کے

درمیان واقع زرخیز میدانی علاقے کو ''سومر'' (S u m e r) کا نام دیا اور اسی نسبت سے ''سومیری'' (Sumerians) کہلوائے۔ سومیری تہذیب وتمدن کی باقاعدہ ابتداء لگ بھگ 3500 قبل مسیح میں ہوئی[1]۔ جس کے بعد سومیری تہذیب نے آہستہ آہستہ خود کو انتہائی ترقی یافتہ شہری تہذیب میں بدل لیا اور دنیا کا پہلا علم وادب پر مبنی معاشرہ متعارف کروایا۔

سومیری تہذیب کے مختصر تعارف کے بعد اگلا مرحلہ سومیریوں کے تصورِ قیامت اور اُس کی کتاب ہٰذا کے موضوع سے گہری وابستگی کو تلاش کرنا ہے۔ آج کے عہد میں بھی سومیری تہذیب ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے لیے ایک عظیم ورثہ اور معلومات کے خزانہ سے کم نہیں، کیونکہ سومیری رسم الخط کے پچھلی صدی کے دوران ڈی کوڈ (Decode) ہو جانے کے بعد تحقیق کاروں کو انسان کی اوائلی تہذیبی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا ہے۔ مزید برآں، ماہرینِ انسانیات (Anthropologists) کو انسان کے معاشرتی وتہذیبی ارتقاء کے عمل کو سومیریوں کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں سمجھنے میں بے انتہا مدد ملی ہے۔ سومیری تہذیب کی ایک اور خوبی اس کی انتہائی ترقی یافتہ ''اساطیر'' (Mythology) ہے۔ اساطیر دیوتاؤں اور مافوق الفطرت قوتوں کے ایسے مذہبی نظام کو کہتے ہیں، جن کے بارے میں انسان یہ عقیدہ قائم کر لے کہ وہ کائنات کا نظم ونسق چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ سومیری اساطیر انسانی تاریخ کا وہ پہلا تحریر شدہ مذہبی نظام ہے، جس نے زمین وآسمان کی تخلیق سے لے کر کائنات کے اختتام تک کے تمام حالات و واقعات کیلئے نہ صرف مختلف تصورات پیش کیے، بلکہ اُن کو قلمبند بھی کیا۔ انسان کی تہذیبی تاریخ میں جو اوّلین مذہبی کتاب مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) موضوعات پر وجود میں آئی، وہ سومیریوں کی ''اینوما ایلش'' (Enuma Elish) تھی، جس نے نہ صرف سومیری لوگوں کی زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا بلکہ آنے والی تہذیبوں اور مذہبی فکر کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنے اثرات کے شکنجے میں لے کر سوچ اور عقائد کے مخصوص زاویئے مقرر کر دیئے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس کتاب میں طوفانِ نوحؑ کا تذکرہ بھی موجود ہے، جو کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں کے مذہبی صحائف میں بھی مذکور ہے۔ اینوما ایلش علم فلکیات کے

1۔ 3500 قبل مسیح کے لگ بھگ ''رسم الخط'' کی ایجاد ہوئی اور انسان نے 'تحریر' کا آغاز کیا۔ یہ انقلابی ایجاد بھی سومیری لوگوں کے حصے میں ہی آئی۔ سومیریوں کی تحریری دستاویزات کے باعث آج ہمارے پاس 3500 قبل مسیح تک کا تاریخی ریکارڈ موجود ہے۔ تاہم ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ سومیری لوگ زراعی نظام کی ابتداء 5500 قبل مسیح میں کر کے تہذیب کی بنیاد پہلے ہی رکھ چکے تھے۔

حوالے سے بھی کافی دلچسپی کی حامل کتاب ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کتاب کوتحریر کیا وہ نہ صرف مابعد الطبیعاتی موضوعات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ علم فلکیات پر بھی انھیں خاصی دسترس تھی۔کیونکہ انہوں نے سیاروں اور ستاروں کے جو مقامات اور مدارات بیان کیے ہیں، وہ حیرت انگیز طور پر صحیح اور سائنسی نقطہ نظر سے قابل مشاہدہ ہیں۔دلچسپ امر یہ ہے کہ نظام شمسی میں سورج کی مرکزی حیثیت سے 300 سال پہلے تک کا انسان ناواقف تھا۔لیکن سومیری لوگ نہ صرف اس حقیقت سے واقف تھے کہ نظام شمسی میں سورج کی حیثیت مرکز کی ہے، بلکہ وہ سیاروں کے مداروں، اُن کی تعداد اور توانائی کے حصول کیلئے اِن سیاروں کے سورج پر انحصار کا علم بھی رکھتے تھے۔یہی سائنسی علم کی وہ انتہائی ترقی یافتہ شکل تھی، جو دورِ جدید کے انسان کو حیران و ششدر کیے ہوئے ہے کہ جب عصر حاضر کی جدید سائنسی تحقیقات سے حاصل کردہ یہی علم محض چند دہائیاں پہلے آگہی کی اُس معراج پر پہنچا جس پر آج کا انسان فخر سے پھولے نہیں سماتا، تو سومیری تہذیب کے باسی آج سے ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے اتنے ماوراء الخطا سائنسی علم تک کیونکر پہنچ گئے؟ کیا آسمان اُن کی براہِ راست دسترس میں تھا یا پھر اُنھیں کسی خلائی مخلوق تک رسائی حاصل تھی جس سے اُنھوں نے یہ تمام معلومات حاصل کیں؟

3500 قبل مسیح میں سومیریوں نے Cuneiform رسم الخط کی بنیاد ڈالی اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کو اپنی تہذیبی زندگی کے ساتھ محفوظ کرنا شروع کر دیا۔جس چیز پر تحریر لکھی جاتی تھی وہ ''پختہ مٹی کی تختیاں'' (Clay Tablets) ہوا کرتی تھیں۔یہ تختیاں ہر طرح کے سرکاری و غیر سرکاری، تاریخی، سائنسی، معاشی اور معاشرتی ریکارڈ رکھنے کیلئے استعمال کی جاتی تھیں۔حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک تختی پر نظام شمسی کی بالکل صحیح تصویر بنائی گئی ہے، جس میں سورج ایک چمکدار عظیم الجثہ ستارے کی مانند درمیان میں ہے۔جبکہ دس سیارے مختلف مداروں میں اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔مزید حیرانی کی جو بات ہے وہ یہ ہے کہ سیارہ زمین، جس کو سومیری لوگ ''تیامت'' (Tiamat) کہتے تھے، تیسرے نمبر پر ہے اور اس کا سائز بھی جدید سائنسی دریافت کے عین مطابق بہت چھوٹا ہے۔اس تصویر میں سائز کے اعتبار سے سیارہ مشتری کو ہی سب سے بڑا دکھایا گیا ہے۔اس سارے معاملہ میں جہاں سائنسدان اس بات سے پریشان ہیں کہ سومیری لوگوں نے اتنا گہرائی سے کائنات کا مشاہدہ و مطالعہ کیسے کیا، وہیں وہ دسویں سیارے کے معمے کو حل کرنے کیلئے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔امریکی خلائی تحقیقی ادارے ناسا (NASA) نے اس معمے کو حل کرنے

کیلئے سومیری لوگوں کی چھوڑی ہوئی معلومات کے مطابق 1970ء میں اس سیارے کا ایک کمپیوٹر ماڈل تیار کیا اور اس کو ''پلینیٹ ایکس'' (Planet X) کا نام دیا۔ ناسا کے مطابق یہ سیارہ اپنی جسامت میں زمین سے کم از کم پانچ گنا بڑا ہے اور اس کا ترچھا (Eliptical) مدار کئی ہزار سال پر مشتمل ہے۔ سومیری ماہرینِ فلکیات کے مطابق بھی اس سیارے کی جسامت زمین سے کئی گنا زیادہ تھی۔ مزید برآں، سومیری لوگ کئی اور تباہ کن انکشافات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کے بقول یہ سیارہ جسے وہ ''نبیرو'' (Nibiru) کے نام سے جانتے تھے کافی عرصہ پہلے زمین کے بہت قریب سے گزرا تھا۔ نبیرو کے سیارۂ زمین کے قریب سے گزرنے کی وجہ سے زمین پر ایک بہت بڑی تباہی آئی تھی، جس کا سب سے ہولناک پہلو ایک عالمگیر سیلاب (Global Deluge) تھا۔ اس سیلاب نے لگ بھگ 90% زمینی مخلوقات کو ہلاک کر دیا۔ ان مخلوقات میں خاص طور پر قابلِ ذکر ایسے بڑے جانور ہیں جن کو ہم ڈائنوسار کے نام سے جانتے ہیں۔ آسان زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبیرو سیارہ کی لائی ہوئی تباہی نے ڈائنوسار اور دیگر دیو قامت جانوروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اگر سومیریوں کی بنائی ہوئی اُس تصویر کو دیکھا جائے جس میں نظامِ شمسی کو دکھایا گیا ہے، تو اس میں ہمیں ایک سیارہ باقی سیاروں سے کافی ہٹ کر ایک طرف جاتا ہوا دکھائی دیگا۔ جو کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سومیری ماہرین فلکیات بھی اس سائنسی حقیقت سے آشنا تھے کہ نبیرو سیارے کا مدار ترچھا ہے اور وہ سورج کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے حتمی نقطۂ قرب (Perigee) پر آ جاتا ہے۔ اگلے مرحلے میں نبیرو کا اپنے بعید ترین مقام (Apogee) کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے اسے ہزاروں سال کا وقت لگتا ہے۔ سائنسدانوں نے Planet X یا Nibiru کے مداری وقت کے حوالے سے جو مختلف نظریات پیش کیے ہیں، اُن کے مطابق نظامِ شمسی کے اس ''نامعلوم'' دسویں سیارے کو اپنا مدار مکمل کرنے میں 3800 تا 12000 سال لگتے ہیں۔ تاہم Planet X کے بارے میں موجود تمام سائنسی حقائق ہم اپنے سائنسی تحقیقات پر مبنی باب میں ہی پیش کریں گے اور فی الوقت ہم خود کو محض تاریخی نوعیت کے شواہد تک محدود رکھیں گے۔

سومیری اساطیر کے مطابق زمین پر نسلِ انسانی کے وجود اور تہذیب کے ارتقاء کا ''زراعت'' (Agriculture) کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ دجلہ و فرات جیسے دریاؤں کی صورت میں

پانی کے وسیع ذخائر کا میسر آنا اوران دریاؤں کی طرف سے بچھائی گئی زرخیز مٹی کی تہہ جو کہ زراعت کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، ” وہ عظیم ترین نعمتیں تھیں جو کسی بھی شہری تہذیب کے جنم اور ارتقاء کیلئے بنیادی شرائط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سومیری لوگوں نے زرخیزی، پانی، گندم، بارش، زمین اور دولت کو مافوق الفطرت قوتوں سے منسلک کر کے اُن کے دیوی دیوتا بنا رکھے تھے۔ تاہم جو بات خصوصی توجہ کی حامل ہے، وہ سومیری اساطیر میں نبیرو سیارہ اور گندم (زراعت) کا گہرا باہمی تعلق ہے۔ آسمانوں اور زرخیزی کے دیوتا ”انو“ (Anu) کو جس سیارہ سے منصوب کیا جاتا ہے، وہ نبیرو ہی ہے۔ سومیری عقیدہ کے مطابق انو دیوتا نبیرو سیارہ پر رہائش پذیر ہے[1]۔ اور اُس نے نبیرو سیارہ کے پچھلے چکر کے دوران، جب نبیرو سیارۂ قیامت (زمین) کے پاس سے گزر رہا تھا، زمین پر آ کر انسانوں کو ”ہل“ (Plow) کا تحفہ دیا تھا اور زراعت کا ہنر سکھایا تھا۔ یہ کہانی نہ صرف تحریری طور پر دستیاب ہے بلکہ اس کی تصویر بھی موجود ہے۔ جس میں انو دیوتا کو انسانوں کو ہل دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جبکہ پس منظر میں نبیرو سیارہ بھی نظر آ رہا ہے۔ اس مقام پر ہمارے لئے دو نکتے اہم ہیں۔ اوّل زراعت کی ابتداء اور اس سے سیارے کا تعلق، اور دوم نبیرو سیارے کا اپنا وجود۔ پیشتر اس کے کہ ہم سیارہ نبیرو اور زراعت کے تعلق کی جانچ کریں، خود اس سیارہ کے بارے میں کچھ مزید تحقیق کر لی جائے۔ اور جو بھی معلومات دستیاب ہیں اُن کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ نبیرو جیسے ایک سیارہ کے قربِ قیامت میں ظہور کے بارے میں عیسائی صحیفہ نے بھی کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ موجودہ تناظر میں عیسائی عہد نامہ جدید کے اس نقطہ نظر کو زیر بحث لانا ” بہت سودمند رہے گا۔ عہد نامہ جدید کی کتاب ”مکاشفہ“ (Revelation) جو عیسائیوں میں قیامت کے موضوع پر حتمی سند سمجھی جاتی ہے، بھی اس روشن سیارے کے زمین پر پہنچنے کا تذکرہ بڑی شد و مد سے کرتی ہے۔ یوحنا حواری (John the Apostle) کتابِ مکاشفہ کے باب نمبر آٹھ، آیات نمبر دس اور گیارہ میں لکھتے ہیں۔

"And there fell a great star from heaven, burning as it were a lamp, and it fell upon the third part of the rivers, and upon the fountain of waters; and the name of the star is called Wormwood; and the third part of the waters

1۔ اساطیری مذاہب کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو سیاروں، ستاروں، چاند اور سورج سے منسلک کر کے پوجتے ہیں۔ اس رسم کی داغ بیل بھی سومیریوں نے ہی ڈالی تھی۔ اُن کے نزدیک سورج، چاند اور نظامِ شمسی کے سبھی سیارے دیوی یا دیوتا تھے۔

became wormwood, and many men died of the waters because they were made bitter."

(Revelation 8:10-11)

ترجمہ:

''اور ایک بڑا ستارہ مشعل کی طرح جلتا ہوا آسمان سے لڑھک آیا اور تہائی دریاؤں اور پانی کے چشموں پر آن لگا۔ اس ستارے کا نام ''ناگ دونا'' (Wormwood) کہا جاتا ہے اور تہائی پانی ناگ دونے کی طرح کڑوا ہو گیا اور پانی کے کڑوا ہو جانے سے بہت سے آدمی مر گئے۔''

(مکاشفہ: باب ۸، آیات ۱۰-۱۱)

مذہبی سیاق و سباق اور تشریحات سے ہٹ کر جو چیز یہاں سومیروں کے ساتھ مشترک اور قابل توجہ ہے، وہ ستارے/سیارے کے ظہور کا بیان ہے۔ ایک بات جس کی یہاں وضاحت کرنا راقم الحروف لازمی سمجھتا ہے ستارے اور سیارے کا سائنسی لحاظ سے فرق ہے، جس سے زمانہ قدیم کے لوگ قطعی ناواقف تھے۔ ماضی کے لوگ سورج اور چاند کے علاوہ آسمان پر چمکنے والے ہر جسم کو ستارہ ہی سمجھتے تھے۔ اس بات کی وضاحت جدید سائنس نے مشاہدات کے ایک لمبے سلسلے کے بعد کی کہ سیارے اپنی روشنی نہیں رکھتے اور ستاروں کے گرد نہ صرف چکر لگاتے ہیں بلکہ اُن سے روشنی بھی حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا جب کوئی سماوی جسم جب انتہائی روشن نظر آئے یا وہ زمین کے بہت قریب آن پہنچے تو ہم اس عمل کو ستارے کا چمکنا یا زمین کی طرف لڑھکنا ہی کہیں گے۔

بائبل مقدس میں موجود کتابِ مکاشفہ کی گواہی کے بعد ایک بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہوئی کہ ایک بہت روشن ستارہ جو زمین سے کافی بڑا ہوگا، قربِ قیامت میں زمین سے آن ٹکرائے گا اور اس کے باعث زمین پر بہت ساری اموات واقع ہوں گی، پینے کا پانی زہریلا ہو جائے گا اور آبی مخلوق بھی ہلاک ہو جائے گی۔

بائبل کے حوالہ کے بعد اب ہم واپس اپنے پچھلے موضوع کی طرف چلتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبیرو سیارہ اور زراعت کی ابتداء کے درمیان ایسا کونسا تعلق پایا جاتا ہے، جس کو سومیریوں نے تصویریں بنا کر اور مٹی کی تختیوں پر تحریریں لکھ کر بیان کرنا چاہا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق

زمین پر زرعی انقلاب (Neolithic Revolution) کی ابتداء لگ بھگ 10000 قبل مسیح میں ''اچانک'' ہوئی۔ تاہم زراعت کا باقاعدہ آغاز جس میں ہل اور آبپاشی کے نظام کا استعمال بھی شامل تھا، 5500 سے 5300 قبل مسیح کے دوران دجلہ وفرات کے درمیان واقع زرخیز قطعہ زمین پر ہوئی۔ چونکہ اُس خاص عہد کے دوران کھیتی باڑی کیلئے ہل کا استعمال پہلی دفعہ کیا گیا تھا، جبکہ سومیریوں کے مطابق ہل نبیرو سیارہ کے رہائشی انو دیوتا کی طرف سے اہلِ زمین کو تحفتہً دی گئی تھی، اس لئے یہ سارا معاملہ ہمیں کم از کم اتنا سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ سائنسی بنیادوں پر تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ اُس زمانہ میں آخر کونسا ایسا عظیم واقعہ رونما ہوا تھا جس نے سطح زمین کو یکا یک زرخیز بنا کر کاشت کے قابل کر دیا تھا؟ ماہرین ارضیات (Geologists) جانتے ہیں کہ زمین تین طویل المدت برفانی زمانوں (Ice Ages) سے گزر چکی ہے۔ آخری برفانی زمانے (Pleistocene) کا خاتمہ 10000 قبل مسیح کے لگ بھگ ہوا اور زمین کا درجہ حرارت جو کہ نقطۂ انجماد سے سینکڑوں درجے منفی پر تھا بہت تیزی سے بلند ہو کر 50 درجے سیلسئس (Celsius) تک چلا گیا۔ ماہرین ارضیات، فلکیات، حیاتیات اور بحریات کا ماننا ہے کہ یہ اچانک تبدیلی کسی عظیم سماوی حادثہ کی بدولت آئی، جو کہ اپنی ہیئت میں انتہائی شدید تھا۔ تمام دستیاب ثبوت اس بات کی شہادت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہ حادثہ کسی عظیم الجثہ سیارے کے زمین کے قریب سے گزرنے کی صورت میں پیش آیا۔ جس کے کھنچاؤ (Gravity) کی وجہ سے نہ صرف کرۂ ارض پر جمی ہوئی برف پگھل گئی، بلکہ سمندروں کی سطح بلند ہو کر ایک عالمگیر طوفانی سیلاب کی شکل اختیار کر گئی۔ غالب امکان ہے کہ یہی وہ طوفانی سیلاب ہے جسے سامی مذاہب نے ''طوفانِ نوحؑ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس عالمگیر طوفانی سیلاب کے سائنسی شواہد ہمیں آج بھی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ قراقرم جیسے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں میں ملتے ہیں۔ جہاں آبی چٹانی قات، بالخصوص گھٹیں ں کے ڈھانچے بکثرت دریافت ہو چکے ہیں۔ ماہرین ایک عرصہ تک اس معمے کو حل نہ کر پائے کہ سمندری چٹانی قات اس قدر بلندی تک کیسے پہنچیں؟ تاہم وقت کے ساتھ شواہد کی دستیابی نے اس نظریہ کو بہت تقویت دے دی ہے کہ آخری برفانی عہد کے اختتام پر آنے والا سیلاب اس قدر بلند تھا کہ اس میں ہمالیہ اور قراقرم جیسے بلند ترین پہاڑی سلسلے بھی ڈوب گئے تھے۔ یہ سیلاب کچھ عرصہ اسی طرح رہنے کے بعد آہستہ آہستہ خشک ہو کر پیچھے ہٹنے لگا اور اس قدر سمٹ گیا کہ کرۂ ارض کے موجودہ سمندری مقامات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ سیلاب کے خاتمہ پر میدانی علاقوں میں خشک مگر زرخیز زمین اُبھر آئی، جس پر

فنِ زراعت کی ابتداء ہوئی۔ پھر جن جن علاقوں کو پانی مسلسل دستیاب رہا، وہاں وہاں زمین غلہ پیدا کرتی رہی اور جہاں جہاں پانی نہ پہنچ پایا وہ جگہیں بارش اور زمینی پانی کی کمی کے باعث صحرا یا چٹیل میدان میں تبدیل ہو گئیں۔

عین ممکن ہے کہ یہ ساری معلومات لوک داستانوں اور زبانی قصے کہانیوں یا مذہبی روایات کی صورت میں سینہ بہ سینہ سومیریوں تک پہنچی ہوں اور اُن کے کاہنوں اور شاعروں نے ان معلومات پر مشتمل ایک طویل کتاب اینوما ایلیش[1] کی صورت میں لکھ دی ہو، جسے بعدازاں مذہبی طور پر مقدس کلام تصور کر لیا گیا ہو۔ چونکہ یہ بات پہلے ہی سومیری لوگوں کے عقائد میں گھر کر چکی تھی کہ دنیا دیوتاؤں کی تخلیق ہے اور وہ اس کا نظم ونسق چلاتے ہیں۔ اس لیے اُن کو یہ ماننے میں ذرا بھر بھی مشکل نہ ہوئی کہ زرخیزی کے دیوتا انو نے اُن کے بادشاہ کو ہل کا تحفہ دے کر زراعت کا فن سکھایا تھا۔ تمام قدیم اذہان کی طرح یہ لوگ بھی اپنے فن میں مہارت اور دیوتا کی خاص خوشنودی کی وجہ سے خود کو دوسری اقوام سے افضل سمجھتے تھے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہو گا کہ سومیری عقائد کے مطابق نبیرو سیارہ کے زمین کی طرف بڑھنے اور زراعت کے آغاز میں کون کون سی کڑیاں باہم ملتی ہیں۔ سومیریوں نے چونکہ فنِ زراعت کا آغاز 5300 قبل مسیح کے لگ بھگ کیا تو اُس وقت تک یہ داستانیں عام ہو چکی تھیں کہ دیوتاؤں نے زمین پر بسنے والے تمام شیطان صفت انسانوں کو ایک عظیم سیلاب میں ہلاک کر دیا تھا اور عراق کے باسی سومیریوں کو اُن کی بہترین صفات کی بنا پر چن لیا تھا۔ اُن کے مطابق دیوتا یہ چاہتے تھے کہ سومیری لوگ نہ صرف نسلِ انسانی آگے بڑھائیں، بلکہ علوم وفنون بالخصوص فنِ زراعت کو بھی ترقی دیں۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس نے سومیریوں کو یہ مان لینے پر مجبور کر دیا کہ نبیرو سیارہ اور انو دیوتا دونوں ہی اُن کیلئے خوش بختی کی علامت ہیں۔ انہی عقائد نے بالآخر اُس حتمی عقیدے کی شکل اختیار کر لی جس کے مطابق انو دیوتا نے سومیری بادشاہ کو ''ہل'' عنایت کر کے زراعت کی ابتداء کے عمل میں برکت ڈال دی۔ مزید برآں، سومیریوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ انو دیوتا نبیرو سیارہ کے اگلے چکر میں انسانوں سے اپنی عطا کردہ نعمت کے حوالے سے پوچھ گچھ کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس احتساب

1۔ ''اینوما ایلش'' کا لفظی معنی ہے ''جیسا کہ آسمان پر ہوا'' (As Above Happened)۔ مرکب لفظ اینوما ایلش کا مفہوم ہمارے نظریہ کے اثبات کی ایک بڑی ہے کہ یہ سومیریوں کی یہ مذہبی کتاب کسی آسمانی حادثہ سے شروع ہو کر آگے آنے والے واقعات کو ترتیب وار بیان کرتی چلی جاتی ہے۔

کے دوران وہ کوئی شدید سزا بھی دے۔موجودہ تحقیق کے تناظر میں سومیریوں کا مؤخرالذکر عقیدہ بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ انہوں نے یہاں نبیرو سیارہ کی واپسی کی پیشگوئی کی ہے اور یہی ہماری بحث کا منطقی وحتمی نکتہ ہے۔اگرچہ سومیری تقویم یا اساطیر میں نبیرو کی واپسی کا کوئی ٹائم فریم نہیں دیا گیا۔تاہم سومیری تحریروں سے ہم کچھ ایسے شواہد ضرور اکٹھے کر سکتے ہیں، جن کی مدد سے حوصلہ افزاء نتائج تک پہنچا جا سکتا ہے۔

سومیریوں کی مذہبی دستاویز ''اینو ما ایلش'' کی آیات 131-130 میں یوں تحریر ہے:

''نبیرو ایک روشن ستارہ ہے، جو آفاق پر اچانک ظاہر ہوا۔آسمان کے ستارو! نبیرو کو تم آسمان پر رہنمائی کیلئے آگے چلنے دو اور راستہ ہموار کرنے دو۔چلو اسے دیوتاؤں کے ستاروں کے گرد حفاظتی حصار بنانے دو۔''

(اینو ما ایلش: تختی ۵، آیات ۱۳۰-۱۳۱)

ایک اور تختی پر مرقوم ہے کہ نبیرو آسمانِ دنیا کے حتمی سرے پر قابض ہے اور کوئی بھی ستارہ (درحقیقت سیارہ) اپنے راستے اور مقام کو چھوڑ کر آگے نہیں نکل سکتا اور نہ ہی باہر سے کوئی اندر آ سکتا ہے۔ نبیرو ایک چوکیدار کی طرح اپنے راستے پر موجود ہے[1]۔

ان قدیم تحریروں میں اگرچہ توہم پرستی کا عنصر کافی حد تک موجود ہے۔تاہم جو ایک چیز ان تحریروں سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، وہ نبیرو سیارہ کا طویل مدار ہے۔جس کیلئے سومیریوں نے ''حصار'' کا لفظ استعمال کیا۔یہاں حصار سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبیرو کا ترچھا مدار اس قدر طویل ہو کہ وہ باقی تمام سیاروں کے اُوپر سے گھوم کر واپس آتا ہو اور پھر سورج کے قریب سے گزرتا ہو۔سورج کے اتنا قریب سے گزرنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبیرو کا مدار زمینی مدار سے رگڑ کھاتا ہو۔

سومیری تہذیب کے ضعیف الاعتقادی اور اساطیری عوامل اپنی جگہ، لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ دور بین اور دیگر جدید آلات کی مدد کے بغیر بھی مظاہر قدرت کے بہترین مشاہدہ کار تھے اور اُن کی نظروں سے کائنات کے دور اُفتادہ گوشے بھی اوجھل نہ تھے۔سومیریوں کی اسی مہارت کے باعث آج کی سائنس بھی

1. Wolfram von Soden, "Zeitschrift fur Assyriologie", No. 47, p. 17

اُن کی تحریروں سے رہنمائی لینے پر مجبور ہے۔

کچھ جدید سائنسی حلقوں میں نبیرو کو ''ہرکولوبس'' (Hercolubus) یا ''ریڈ پلینٹ'' (Red Planet) بھی کہا جاتا ہے۔علاوہ ازیں، کچھ تجزیہ نگاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس سیارہ پر زندگی کے آثار موجود ہیں اور کوئی ایسی مخلوق آباد ہے، جو ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے[1]۔ تاہم اس بات کی سائنسی تصدیق ابھی تک سامنے نہیں آئی۔ جدید سائنس جن زاویوں پر کام کر رہی ہے، وہ صرف اور صرف زمین اور نبیرو سیارہ کے تصادم سے بچاؤ کے ممکنہ طریقے دریافت کرنا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کا کوئی حل دریافت نہیں کیا جا سکا اور سائنسدان اپنی تحقیقات میں ایک شدید نوعیت کی غلطی کا اعتراف بھی کر رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ کوئی راستہ جلد یا بدیر نکل ہی آئے۔ اگر وہ سائنسی غلطی جس کا تذکرہ اُوپر کیا گیا ہے، واقعتاً حقیقی ہے اور شدید اثرات کی حامل ہے، تو پھر '' اس ٹکراؤ کو روکنا ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے پاس بہت کم وقت باقی بچا ہے۔ نبیرو سیارہ کے ٹکرانے سے یقینی طور پر زمین ایک ایسے شدید دھماکے سے پھٹ جائے گی جس کی شدت لاکھوں ایٹم بموں کی قوت کے برابر ہوگی اور زمین کا وجود شہابیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر ختم ہو جائے گا۔ یہ عمل بلا شک وشبہ 21 دسمبر 2012ء کو واقع ہوگا۔ کیونکہ نبیرو کی واپسی 2012ء کے آخر میں متوقع ہے۔ نبیرو سیارہ کی واپسی کے ٹائم فریم پر تفصیلی بحث سائنس کے تحت لکھے گئے باب کی گئی ہے۔ پس عالمِ انسانی کو 21 دسمبر 2012ء کا انتظار بطور ''یومِ ساعت'' کرنا چاہئے، تا کہ موت آن پہنچنے کی صورت میں انسان بے خبری میں نہ مارا جائے۔

1۔ مزید تفصیلات کے لیے مطالعہ کیجئے:

V. M. Rabolu, Hercolubus Or Red Planet, Spain, 2008

قدیم کہانت میں وقتِ قیامت کا تعیّن

Determining Doomsday Time Predicted by Ancient Oracles

زمانہ قبل از تاریخ سے مذہب کے بعد اگر کوئی دوسرا شعبہ مستقبل کے احوال کو بیان کرتا اور اُن پر گہری نظر رکھتا ہوا آیا ہے تو وہ ''کہانت'' ہے۔ زمانہ قدیم میں جہاں انبیاءؑ نے مستقبل کی خبر دینے کا فریضہ سرانجام دیا، وہیں کاہنوں (Oracles) نے بھی مستقبل کو پردۂ لاعلمی سے باہر لانے کی بھرپور سعی کی۔ انبیاءؑ کے حوالے سے یہ امر طے شدہ ہے کہ انہیں مستقبل کی تمام خبریں بذریعہ وحی پہنچائی جاتی ہیں۔ لیکن کاہنوں کو ایسی معلومات کہاں سے ملتی ہیں جن کی مدد سے مستقبل کے واقعات قبل از وقت بیان کر دیتے ہیں، ہم اس

کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کہانت ماضی کے انسان سے لے کر آج کے جدید انسان تک ایک پُراسرار راز ہی رہی ہے۔ تاہم جو چیز کہانت کے حوالے سے بے حد چونکا دینے والی ہے، وہ قدیم کاہنوں کی اکثر پیشین گوئیوں کا ہو بہو پورا ہونا ہے۔ کہانت کا اساطیری ادارہ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں مقبول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر خطہ میں کاہنوں کی موجودگی کے شواہد ملتے ہیں۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے دنیا کے دور افتادہ علاقوں میں بھی ایسی پراسرار عمارات دریافت کی ہیں جن کا استعمال خالصتاً کہانت اور علم نجوم کے مقاصد کے لیے ہوتا تھا۔ ماضی قدیم میں کہانت کے کچھ مراکز ایسے بھی موجود رہے ہیں، جن کا حلقۂ اثر پورے پورے براعظم تک پھیلا ہوا تھا۔ انہی میں قدیم یونان کا معروف ترین مرکزِ کہانت ''ڈیلفی'' بھی شامل ہے، جس نے آنے والے ادوار میں ادب اور دینیات دونوں پر ہی اپنے اثرات چھوڑے۔

قدیم زمانہ کے چند معروف کاہنوں میں '' کاہنِ ڈیلفی (Oracle of Delphi)، سبیلین رومی کاہنہ (Sibylline the Oracle)، انگریزی کاہن مرلن (Merlin the English)، کاہنِ طائف، کاہنِ سومنات، کاہنِ بنگال اور معروف فرانسیسی کاہن ''ناسٹراڈیمیس'' (Nostradamus) وغیرہ شامل ہیں۔ تاریخ میں ان سب کا اہم کردار رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک خاص عہد تک تہذیب و ادب کو متاثر کیے رکھا۔

''کاہن'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں ''ایسا شخص جو اسرارِ الٰہی اور غیبی باتوں کے علم کا مدعی ہو۔'' یہودیوں کے نزدیک کہانت ایک جائز عمل ہے اور کاہن وہ ہوتا ہے جو یہودیوں کی قربانیوں کو خدا کے حضور پیش کرے اور خدا و انسان کے درمیان وکیل کا کردار ادا کرے۔ عیسائیوں کے نزدیک کاہن ایسا شخص ہوتا ہے جو اچھے اعمال کی وجہ سے کہانت کے درجے پر فائز ہو اور اسرارِ الٰہی اُس پر کھلنے لگیں۔ اُن کے عقیدے کے مطابق ایسا شخص کرامات ظاہر کر سکتا ہے اور دوسروں کی حاجت روائی پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ چند عیسائی فرقوں میں آج بھی کہانت کا شعبہ رائج ہے اور پادری حضرات میں سے بلند مرتبت لوگ کاہن مقرر کیے جاتے ہیں۔ وہ انہیں Seer, Oracle یا Prophet کا نام دیتے ہیں اور اکثر اُن کی باتوں کو ظہورِ قیامت اور حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کے موضوعات پر حتمی سمجھتے ہیں۔

سامی مذاہب سے باہر دیگر مذاہب میں کہانت کا تصور توحید سے شرک کی طرف چلا جاتا ہے۔ اساطیری مذاہب میں ایک کاہن ہمیشہ کسی خاص دیوی یا دیوتا کے مندر / ہیکل سے منسلک ہوتا ہے اور

وہ اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ اسی مخصوص دیوی یا دیوتا سے اسرارِ غیبی کی معلومات وصول کرتا ہے۔ کہانت توحیدی ادیان کی نسبت شرک پر مبنی مذاہب میں بہت زیادہ عام ہے۔ مشرک مذاہب کے عقائد اور روایات کے مطابق دیوتا اپنا ''مخصوص پیغام'' ایک کوڈ (Code) کی صورت میں کاہن تک پہنچا دیتا ہے۔ جسے وہ ڈی کوڈ (Decode) کر کے ضروری تشریح کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر قدیم یونان کے شہر ''ڈیلفی'' (Delphi) میں اپولو دیوتا کے مندر پر مبعوث کاہنہ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اسے ''اپولو دیوتا'' (Apollo) کی طرف سے عجیب وغریب آواز سنائی دیتی ہے، جس کو صرف وہی سمجھ سکتی ہے۔ یورپ، افریقہ اور ایشیا کے لوگ مہینوں کا سفر طے کر کے اپنی مشکلات اور معمات کے حل کے لیے ڈیلفی جاتے اور وہاں کاہنہ سے مل کر اپولو دیوتا سے اُن کا حل پوچھنے کی درخواست کرتے۔

کاہن کی سرگرمیوں کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اپنے اگلے موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ کتاب ہذا میں صرف دو معروف کاہنوں کی پیشگوئیاں درج کی جا رہی ہیں جن میں سے ایک ''سیبلین رومی'' اور دوسرا ''ناسٹراڈیمیس'' ہے۔ موزوں رہے گا کہ پہلے ناسٹراڈیمیس کے حوالے سے بات ہو جائے۔

ناسٹرا ڈیمیس 1503ء میں فرانس میں پیدا ہوا اور 1566ء میں فرانس ہی میں وفات پائی۔ ناسٹراڈیمیس عہدِ جدید میں کافی مقبول ہے اور مشرق ومغرب میں لوگ اُس کی پیشگوئیاں یکساں شوق سے پڑھتے ہیں۔ ناسٹرا ڈیمیس کی مقبولیت کی ایک نئی لہر 11 ستمبر 2001ء سانحہ کے بعد آئی، کیونکہ WTC کے ''جڑواں ٹاورز'' کے گرنے کے بعد ناسٹراڈیمیس کے قارئین پر یہ منکشف ہوا کہ ان حملوں کی بالکل صحیح پیشگوئی ناسٹرا ڈیمیس پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس پیشگوئی میں اُس نے نیویارک شہر، دیوہیکل پرندوں، آسمان میں 45 درجے کے زاویئے پر آگ سے کسی چیز کے جلنے اور اس کے بعد پیدا ہونے والی عالمی صورتحال کے حوالے سے بتایا ہے۔ ناسٹرڈیمیس کے حوالے سے یہی بات انتہائی حیران کن ہے کہ وہ پیشگوئی کرتے وقت مستقبل میں ہونے والے واقعات میں شامل شخصیات اور جگہوں کا بالکل ٹھیک ٹھیک نام استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگِ عظیم (World War II) کے حوالے سے بیان کردہ پیشگوئی میں ''ہٹلر'' اور ''جرمنی'' کا تذکرہ بڑے واضح انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''نازیوں'' (Nazis) کی طرف سے ''ہولوکاسٹ'' کے لیے قائم کردہ گیس چیمبرز اور کنسنٹریشن کیمپس کا ذکر بھی اس پیشگوئی میں موجود ہے۔ اسی طرح لندن میں 1666ء میں لگنے والی آگ، جسے ''لندن کی عظیم

آگ" کے نام سے پکارا جاتا ہے، کے بارے میں کی جانے والی پیشگوئی میں ناسٹراڈیمیس نے "لندن کی عظیم آگ" اور "66 کے سال" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ ناسٹراڈیمیس کی طرف سے یہ پیشگوئی لندن میں لگنے والی آگ سے کم از کم ایک صدی قبل کی گئی۔ اس آگ میں دو تہائی لندن کا صفایا ہو گیا تھا، اور ناسٹراڈیمیس کی پیشگوئی کے عین مطابق لندن کے اکثریتی عیسائی فرقہ "پروٹسٹنٹ" کے لوگوں کی بڑی تعداد ماری گئی تھی اور اُن کے کلیسا کثیر تعداد میں جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ مزید برآں، ناسٹراڈیمیس کی ایک پیشگوئی میں "نپولین بونا پارٹ" اور اُس کی جنگی چھلکی ت کا تذکرہ ہے، جس کے باعث یورپ خون آلود ہو جائے گا۔

آیئے اب ان تاریخی نوعیت کی حامل انتہائی معروف پیشگوئیوں کو ایک نظر دیکھ لیتے ہیں۔

"The Great Fire of London (1666)"

The Great Fire of London,

The blood of the just will be demanded of London,

Burnt by the fire in the year 66,

The ancient lady will fall from her high place,

And many of the same sect will be killed.

(Century 2, Quatrain 51)

"Napolean: The Great Prince & Emperor"

An Emperor will be born near Italy,

Who will cost the Empire dearly,

It will be said when his allies are seen,

That he is less a Prince than a butcher.

(Century 1, Quatrain 60)

"Adolph Hitler & Germany"

Beasts ferocious from hunger will swim across rivers,

The greater part of the region will be against Hitlar,

The great one will cause it to be dragged in an iron cage,

When the German child will observe nothing.

(Century 2, Quatrain 24)

اِن پوری ہوچکی پیشگوئیوں کا جائزہ لینے کے بعد اب ایک نظر اُن تین معروف پیشگوئیوں کو بھی دیکھ لیا جائے، جو دنیا بھر میں سنسنی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں پیشگوئیاں ماہرین کے مطابق 21 دسمبر 2012ء کے Doomsday فلسفہ کی وکالت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پہلی پیشگوئی ناسٹراڈیمیس کی سوقطعات پر مشتمل درجہ بندی میں آٹھویں درجہ کے ستترویں قطعہ میں وارد ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ناسٹرڈیمیس کی کہانت اس پیشگوئی میں کیا انکشاف کرتی ہے:

"Doomsday 2012"

The antichrist very soon annihilates the three,

Twenty-three years his war will last,

The unbelievers are dead, captive, exiled,

With blood, human bodies, water and red hail covering the earth.

(Century 8, Quatrain 77)

مذکورہ بالا پیشگوئی میں ''دجال'' (Antichrist) کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، جو ناسٹراڈیمیس کے بقول 23 سال تک جنگ و جدل بپا کیے رکھے گا۔ پیشگوئیوں کے ماہرین کے مطابق یہ 23 سالہ جنگ و جدل پرمبنی دور نومبر 1989ء میں اشتراکیت کے نمائندۂ اعظم ''سوویت یونین'' کے انہدام کے بعد شروع ہو چکا ہے۔ اب یہ جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار عیسائی مغرب اور احیاء کی طرف گامزن اسلامی بلاک کے درمیان ہے۔ اہلِ مغرب کے نزدیک دجال اور اُس کا لشکر اسلامی کیمپ کی نمائندگی کرے گا، جو 23 سال تک اہلِ مغرب سے ''خفیہ جنگ'' کے انداز میں برسرِپیکار رہیں گے۔ حالانکہ حقیقت میں دجال کی نمائندگی مغرب اور اُس کی فوجیں کر رہی ہیں، جو حق کے مدعیان کو دنیا بھر میں چن چن کر قتل کر رہی ہیں۔

اکثر ماہرینِ سیاسیات ،جن میں ''فرانسس فوکو یاما''(Francis Fukuyama) معروف ہیں، نے اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے مابین چلنے والی ''سرد جنگ''(Cold War) کے خاتمے کو درحقیقت ''تاریخ کا خاتمہ''(End of History) قرار دیا، کیونکہ اُن کے بقول مغربی تہذیب اوراشتراکیت کے مقابلے میں اب کوئی ایسی مزاحمتی قوت باقی نہ رہی تھی، جس کی موجودگی ایک محرک تاریخ (Dynamic History) کی تشکیل کے لیے اہم کردارادا کرے۔[1]

1989ء میں پاکستان پر'پریسلر ترمیم' کے تحت لگنے والی پابندیاں ابتداء تھی اُس جنگ کی جو اسلامی دنیا کے خلاف لڑی جانے والی تھی۔ان پابندیوں سے پہلے پاکستان امریکہ کے صفِ اوّل کے دوستوں میں شمار ہوتا تھا،لیکن پریسلر ترمیم کے بعد مغربی بلاک میں پاکستان مشکوک اور دہشت گردوں کے حمایتی ملک کے طور پر متعارف کروایا گیا۔اس کے بعد 1991ء امریکہ کی سرکردگی میں مغربی فوجی اتحاد نے عراق پر حملہ کرکے اُمتِ مسلمہ کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کردیا۔تب سے آج تک یہ جنگ کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے اور لاشیں گرنے ،آگ برسنے اور خون کے دریا بہنے کا سلسلہ کبھی نہیں رُکا۔

23 سالوں پر پھیلے یہ دور 2012ء میں ختم ہو جائے گا۔نومبر 1989ء سے دسمبر 2012ء تک کا عرصہ عین 23 سال بنتا ہے۔ اس تناظر میں موجودہ پیشگوئی 21 دسمبر 2012ء کی بطور ''روزِ تباہی''(Doomsday) کے حوالے سے رائج عالمگیر فکر کو اور مضبوط کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دسمبر 2012ء میں رونما ہونے والے فلکیاتی حادثہ کے بارے میں بیان کردہ پیشگوئی اب ذیل میں پیش کی جارہی ہے۔اس میں بہت واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ آسمان پر'' دوسورج'' بادلوں میں سے ظاہر ہوں گے۔ یہاں دوسرے سورج سے مراد اُس سیارے کا آسمان دنیا پر اچانک ظہور ہے، جسے ہم ''نبیرو سیارہ'' یا Planet X کے نام سے جانتے ہیں۔

"The Appearance of Nibiru or Planet X"

---

1. Fukuyama, Franics, The End of History and the Last Man, New York: The Free Press, 1992, "Preface"

The great star for seven days will burn,

The cloud will make two suns appear,

The great mastiff (dog) will be all night howling,

When great pontiff changes his land.

(Century 2, Quatrain 41)

مذکورہ بالا پیشگوئی میں ایک ستارے (درحقیقت نبیرو سیارہ/پلینٹ ایکس) کے سات دنوں تک جلنے اور بادلوں میں سے اس طرح ظاہر ہونے کا ذکر ہے، جیسے یہ دوسرا سورج ہو۔ اس ستارے کے اچانک ظہور کے نتیجے میں ناسٹراڈیمس کے مطابق زمین پر کچھ شدید نوعیت کی تبدیلیاں بھی رونما ہوں گی۔ زمین کا جغرافیہ بدل جائے گا اور لوگ ادھر سے اُدھر بکتیں ہوتے پھریں گے۔ کچھ اہم لوگ جیسا کہ پاپائے روم وغیرہ بھی خطرے والے مغربی حصہ سے نتےظ علاقوں کی طرف نکل کھڑے ہوں گے۔

اگرچہ اس پیشگوئی میں ستارے کے نمودار ہونے کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی، تاہم اس امر کی یہاں پر کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم پہلے ہی جان چکے ہیں کہ پلینٹ ایکس کا ظہور کب ہوگا اور اس بات کی تصدیق کے لیے ہمارے پاس کون کون سے سائنسی شواہد موجود ہیں۔ ناسٹراڈیمس کا اشارہ لازمی طور پر اسی سیارے کی طرف ہے، جو زمین کے بہت قریب سے گزرے گا اور زمین پر اپنی ثقیل کشش کے باعث گہرے اثرات چھوڑے گا۔ بلاشبہ پلینٹ ایکس دسمبر 2012ء میں ایک ڈراؤنے خواب کی طرح نمودار ہوگا۔

ناسٹراڈیمس کی پیشگوئیوں کا اکیسویں صدی میں ہونے والے فلکیاتی حادثہ کے حوالے سے سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ کئی اور قطعات میں آگ کی دم والے ستارے، داڑھی والے ستارے اور خوفناک تباہی والے ستارے کے الفاظ ملتے ہیں۔ وہ اس ستارے کے مختلف رُوپوں کے بارے میں بات کرتا ہے اور اُس کے نمودار ہونے کے اثرات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ابھی جو پیشگوئی ذیل میں پیش کی جا رہی ہے، اُس میں تباہ کن واقعات کی ابتداء اور ستارے کے ظہور کے متعلق ایک ٹائم فریم بھی دیا گیا ہے۔

After a misery for mankind,

An ever greater approaches,

The great cycle of the centuries renewed,

It will rain blood, milk, famine, war, disease,

In the sky will be seen a great fire dragging a trail of sparks.

(Century 2, Quatrain 46)

اس قطعہ میں "The great cycle of the centuries renewed" کے الفاظ انتہائی توجہ طلب ہیں۔ یہیں وہ نکتہ ہے جو ہمارے لیے ٹائم فریم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سطر کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ "جب صدیوں کا عظیم چکر نئے سرے سے شروع ہوگا۔" اس کے بعد وارد ہونے والی سطریں صراحتاً بتا رہی ہیں کہ اس عمل کے ساتھ ہی کچھ دلدوز واقعات کی ابتداء ہوگی، جیسا کہ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جائے گی اور دنیا میں جنگ، قحط، بیماریاں، دکھ اور تباہی ہوں گے۔ یہی وہ وقت ہوگا جب ایک چمکتا دمکتا ستارہ آگ کی مانند زمین کے پاس آن پہنچے گا۔ صدیوں کے عظیم چکر کی نئی شروعات سے مراد تیسرے ہزاریئے (3rd Millennium) کا آغاز ہے، جب گنتی دو ہزار تک پہنچ جانے کے بعد دوبارہ صفر سے شروع ہوگی۔ کیلنڈر کا 2000ء تک پہنچ جانا درحقیقت ہندسوں کے واپس صفر پر آنے کے مترادف ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے، کیونکہ اگلی صدی کی شروعات کے ساتھ ہی ستمبر 2001ء میں آگ اور خون کی عالمگیر ہولی ایسی شروع ہوئی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اب ہمیں آگ جیسے سرخ ستارے (Red Planet) کی جلد آمد کا انتظار کرنا چاہیے، جس کی آمد کا وقت ۲۱ دسمبر 2012ء کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

سبیلین رومی کاہنہ (Sibylline the Oracle) کا دورِ حیات چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔ سبیلین کاہنہ کی خاص بات یہ ہے کہ اُس نے یونانی مفکر سقراط کی پیدائش اور عروج کی پیشگوئی کم از کم ایک صدی پیشتر کر دی تھی۔ اس کے علاوہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، بعثت اور یہود کی اُن سے دشمنی کی خبر بھی اپنی پیشگوئیوں کے ذریعے دے چکی تھی۔ یہی وہ امر تھا جس کی بنیاد پر اوائل دور کے عیسائیوں نے سبیلین رومی اور اُس کی پیشگوئیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُسے خدا کی طرف سے مقرر "نبیہ" قرار دیا۔ مزید برآں، قسطنطین اعظم (Constantine the Great) کی سلطنتِ روما پر بادشاہت کی خبر بھی سبیلین نے لگ بھگ آٹھ سو سال قبل ہی دے دی تھی۔ یہ وہ تین باتیں ہیں، جو سبیلین کی کہانت کو تاریخ کہانت میں انتہائی معتبر بناتی ہیں اور سبیلین کو کاہنوں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ سبیلین کی پیشگوئیاں شاعری کی

صورت میں ہوا کرتی تھیں۔ انھیں پاپائرس کے صحائف پر درج کرلیا جاتا اور سلطنتِ روما کی سرکاری تحویل میں رکھا جاتا تھا۔ رومی بادشاہان ہر معاملے بالخصوص جنگی چھنکی ت کی ابتداء سے پہلے سبیلین کاہنہ سے مشورہ اور رہنمائی لیا کرتے۔

سبیلین کاہنہ کی صرف ایک پیشگوئی پر ہی یہاں اکتفا کیا جارہا ہے۔ کیونکہ باقی پیشگوئیاں طویل اور پیچیدہ ہیں۔ موجودہ پیشگوئی بھی بجائے کوئی ٹائم فریم دینے کے محض اُن حالات پر تبصرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے، جو اکیسویں صدی کے آغاز میں ہی پیدا ہو جائیں گے اور یومِ قیامت کو اپنی انتہا پر پہنچ جائیں گے۔

"Fire shall come flashing forth in the broad heaven, and many cities burn and men destroy, and much black ashes shall fill the great sky, and small drops like red earth shall fall from heaven, and then know the anger of the God of Heaven." – (The Sibylline Oracles, Book 4)

ترجمہ:

''آسمان سے آگ ہی آگ برسے گی، اور بہت سارے شہر جل کر راکھ ہو جائیں گے اور بے شمار لوگ مر جائیں گے۔ آسمان سیاہ راکھ سے بھر جائے گا اور سرخ مٹی جیسے چھوٹے چھوٹے قطرے زمین پر برسیں گے، اور پھر جان جاؤ کہ یہ آسمان کے خدا کا تم پر عذاب ہوگا۔''

یہ پیشگوئی اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے جس تناظر میں آتی ہے، وہ دورِ جدید کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ متن سے ظاہر ہے کہ آسمان سے آگ برسنے کا عمل محض طیاروں کی بمباری کی صورت میں ہی ممکن ہے۔ موجودہ دور میں امریکہ، روس اور دیگر یورپی ممالک کی طرف سے تیار کردہ بمبار طیارے ایک ہی وقت میں سینکڑوں بم برسا سکتے ہیں، جبکہ کچھ بم ایسے ہیں جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر مختلف احداف پر آگ برسانے کا کام دیتے ہیں۔ یہ آخری عالمگیر جنگ کی طرف اشارہ ہے، جو کسی بھی وقت شروع ہو کر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ٹ ت کرۂ ارض سے نسلِ انسانی کا صفایا ہو جائے گا۔

تاہم سبیلین کاہنہ کی یہ پیشگوئی پلینٹ ایکس کے زمین کے قریب آنے اور ممکنہ تصادم کی طرف اشارہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں دنیا ہزاروں ایٹم بموں کی شدت کے دھماکوں سے بھسم ہو جائے گی

اور زمین کی فضا کے ساتھ ساتھ سطحِ زمین بھی آگ ہی آگ سے بھر جائے گی۔ بے شک یہ وقت زمین کا آخری وقت ہوگا اور زمین تانبے کی طرح سرخ ہو جائے گی۔ آسمان سے سرخ انگارے برسیں گے اور جہاں بھی گریں گے ہر چیز کو تہس نہس کرتے چلے جائیں گے۔

یہ پیشگوئیاں کسی بھی طرف اشارہ کرتی ہوں، اس چیز سے قطع نظر ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دنیا کا سفر اپنے آخری مراحل میں ہے۔ کوئی بہت بڑی تباہی نازل ہونے کے بے حد قریب ہے اور یہ کچھ اور نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے یہ آج کے مادیت پرست اور لادین معاشرے کے لیے ''عذابِ عظیم'' ہوگا۔

قیامت، جمعۃ المبارک اور 21 دسمبر 2012ء

Doomsday, Friday & 21 December 2012

اسلام میں جمعہ کا دن انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک مسلمان کیلئے ہفتہ بھر کے احتساب اور برادر مسلمانوں سے میل جول کا دن ہے۔ اس دن مسلمان مسنون انداز میں تیار ہو کر مساجد کا رخ کرتے ہیں، جس سے نہ صرف قربتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے، بلکہ معاشرے میں محبت اور اتفاق کے پہلو بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ جس طرح یہودیوں کیلئے ہفتہ (جس کو وہ ''سبت'' Sabbath کہتے ہیں) کا دن اور عیسائیوں کیلئے اتوار کا دن مذہبی اہمیت کا حامل ہے، بالکل اسی طرح اسلام نے جمعہ کے دن کو ''مبارک و افضل''

ٹھہرایا۔ جمعہ کی اسی عظمت کے باعث ۔۔۔ن اسے محض جمعہ کہنے کی بجائے ''جمعۃ المبارک'' کے نام سے پکارنا پسند کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے وقت جمعہ کی پہلی نماز مسجدِ قبا میں ادا کی اور یوں آپ ﷺ نے ایک ایسے عظیم عمل کی داغ بیل ڈالی جس کا سلسلہ اُس دن کے بعد آج تک نہیں رُکا۔ قرآن میں جمعہ کے دن کی اہمیت اور اس کے احکام کے موضوع پر ایک مکمل سورت ''سورۃ الجمعہ'' کے نام سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ کتبِ حدیث میں یوم جمعہ کے متعلق احکام اور فضیلت پر مبنی علیحدہ باب قائم کیے گئے ہیں، کیونکہ ۔۔عاتِ احادیث میں جمعہ کے بارے میں کثرت سے احادیث وارد ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہدِ نبویؐ سے لے کر آج تک ۔۔۔نوں کے ہاں جمعہ کے دن کو کس قدر عزت و تکریم دی جاتی رہی ہے۔

اسلام میں جمعہ کے دن کی اہمیت کئی اور وجوہات کے باعث بھی ہے۔ اسلام نے جو تصور یومِ جمعہ کے حوالے سے پیش کیا ہے، اُس کے مطابق تخلیقِ آدمؑ جمعہ ہی کے دن ہوئی، جبکہ نسلِ آدمؑ کا اختتام بھی اسی دن ہوگا۔ اس بات کی بازگشت احادیثِ نبوی کے اندر کئی جگہوں پر سنائی دیتی ہے کہ قیامت کا کربناک دن درحقیقت ''یوم الجمعہ'' ہی ہوگا۔ ذیل میں نقل کی جا رہی معتبر روایت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جتنے دنوں میں آفتاب نکلا، اُن سب میں افضل جمعہ کا دن ہے۔ اس دن حضرت آدمؑ پیدا کیے گئے، اسی دن جنت سے اُتارے گئے، اسی دن اُن کا قصور معاف ہوا، اسی دن اُن کی وفات ہوئی اور اسی دن قیامت واقع ہوگی[1]۔''

مزید برآں، حضرت ابو ہریرہؓ ایک اور جگہ بیان فرماتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دھر تلاوت فرمایا کرتے تھے[2]۔''

واضح رہے کہ ان دونوں سورتوں کا موضوع انسان اور قربِ قیامت ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور جگہ پر اوّل الذکر حدیث ایک دوسرے صحابیؓ سے تھوڑے مختلف متن کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ آیئے اُس پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

''حضرت ابولبابہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑا دن ہے۔ (گویا کہ) اللہ کے نزدیک

یہ عیدالاضحیٰ اور عیدالفطر سے بھی بڑا دن ہے۔اس دن میں پانچ باتیں ہیں۔

i۔ حضرت آدمؑ کا پیدا کیا جانا۔

ii۔ آپؑ کا زمین پر اُتارا جانا۔

iii۔ آپؑ کی وفات ہونا۔

iv۔ قبولیتِ دُعا کی خاص گھڑی کا ہونا۔

v۔ قیامت کا قائم ہونا۔[3]

امام بوصیریؒ کے قول کے مطابق یہ حدیث ''حسن'' ہے۔ تاہم اس حدیث کا دوسری مستند کتبِ حدیث میں راویوں کی ایک علیحدہ سند کے ساتھ وارد ہونا اس کو ''صحیح'' کے درجہ پر لے جاتا ہے۔

ان احادیث کی رُو سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق قیامت اور جمعہ کا دن 'لازم وملزوم' ہیں۔نسلِ انسانی کے باپ ''حضرت آدمؑ'' کی تخلیق کی گئی تو وہ جمعہ کا دن تھا، اُن کی توبہ قبول ہوئی تو وہ بھی جمعہ ہی کا دن تھا۔اور جب قیامت قائم کی جائے گی تو وہ بھی جمعہ کا دن ہی ہوگا۔اب جب کہ ہم قربِ قیامت کے دور میں رہ رہے ہیں، تو ان احادیث سے ہم یہ اخذ کرسکتے ہیں کہ قیامت کے متعلق ہر پیشگوئی کے ''صحیح'' یا ''غلط'' ہونے کی بنیادی شرط یہی ہے کہ جس دن کی بطور یومِ قیامت نشاندہی کی جائے وہ جمعہ ہی کا دن ہو۔اس کتاب میں پیش کردہ ہمارا مؤقف بھی مذکورہ بالا احادیث سے تقویت پاتا ہے۔جبکہ اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ 21 دسمبر 2012ء کا دن بہت سارے مضبوط شواہد کی روشنی میں یومِ قیامت ثابت ہوتا نظر آرہا ہے۔قارئین کیلئے یہ بات شاید کسی ذہنی جھٹکے سے کم نہیں کہ 21 دسمبر 2012ء کو درحقیقت ''جمعۃ المبارک'' ہی کا دن ہوگا۔یوں اسلامی نقطۂ نظر سے بھی ہمیں ایک بہت مضبوط دلیل حاصل ہوجاتی ہے، جوکہ راقم الحروف کے اس کتاب میں پیش کردہ نقطۂ نظر کی تصدیق کرکے 21 دسمبر

1۔(الف) سنن ابی داوٗد۔باب تفریع ابواب الجمعہ: حدیث نمبر 1033

(ب) موطّا امام مالک۔باب یوم الجمعہ۔(ج) صحیح مسلم۔کتاب الجمعہ: حدیث نمبر 1854

2۔صحیح بخاری۔باب یوم الجمعہ: حدیث نمبر 500

3۔ابن ماجہ۔باب فضل الجمعہ: حدیث نمبر 1084

2012ء کی تاریخ کو کیلنڈر میں باقی دنوں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ مزید برآں بعض روایات میں آتا ہے کہ قیامت محرم الحرام کے چھبیسویں میں واقع ہو گی اور دن جمعۃ المبارک کا ہو گا۔ اگر معاملہ کو اس زاویہ سے بھی دیکھا جائے تو بات بجائے بگڑنے کے بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، کیونکہ 21 دسمبر 2012ء کو اسلامی کیلنڈر میں جو مہینہ مطابقت پر آئے گا، وہ محرم الحرام ہو گا۔ قارئین اگر چاہیں تو اس کی خود گنتی کر لیں یا پھر اس معاملے کی چھان بین کے لیے کسی معتبر تقویم کا سہارا لے لیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا 21 دسمبر 2012ء کے بارے میں پہلے سے دستیاب شواہد کے علاوہ اس دن کی بطور جمعۃ المبارک شناخت از خود ایک بہت بڑا ثبوت نہیں؟ کیا اب بھی اس دن کے اندر چھپی خوفناک حقیقت کے اعتراف میں کوئی مذائقہ ہے؟ اب ٹ ت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ 21 دسمبر 2012ء بھی باقی سب دنوں کی طرح عام سا دن ہو گا۔ 21 دسمبر 2012ء میں لازماً ایسا کچھ خاص ہے کہ انسانی علم کی تمام جہتیں اسی ایک دن کا بطورِ یوم قیامت تعین کر رہی ہیں۔ منطقی ذہن رکھنے والے لوگ جان چکے ہیں کہ اس ایک اسلامی کڑی کا مل جانا درحقیقت بہت سی کڑیوں کے باہم مل جانے کے مترادف ہے۔ چونکہ ایک ۔ یتہ ن کیلئے تمام بیرونی شواہد سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسلام ایسے امور پر کیا تعلیم دیتا ہے۔ ہم اس کتاب میں قیامت کے حوالے سے رائج تقریباً سبھی معلومات کو زیرِ بحث لا چکے ہیں۔ ہم تصورِ مہدیت، نزولِ مسیحؑ اور فتنۂ دجال کا تنقیدی و تعمیری جائزہ بھی لے چکے ہیں، اور جو تمام ممکنہ تشریحات سامنے آ سکتی تھیں، پیش کی جا چکی ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے عقائد اسلامی تعلیمات کا حصہ بہت بعد میں بنے۔ لہٰذا ایسے عقائد و تصورات سے معاملہ کرتے ہوئے ایک محقق کو بال کی کھال اتارنی چاہئے۔ اسی میں اسلام اور امتِ مسلمہ دونوں کی بھلائی ہے۔ اب جہاں ہمیں وقت کے ساتھ رواج پا جانے والے تصورات کو اسلام کی اصلی تعلیمات سے جدا کرنے کی ضرورت ہے، وہیں ہمیں سائنسی ترقی، بیرونی حقائق اور مستقبل کے خطرات کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور جرأت و ہمت سے اُن کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے۔

21 دسمبر 2012ء اگر جمعہ کا دن نہ ہوتا تو پھر بہت سی اشکالات سامنے آ سکتی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ پھر اس کتاب کو لکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن جب مستند احادیث سے ثابت ہو گیا کہ قیامت جمعہ ہی کے روز وقوع پذیر ہو گی اور یہ کہ 21 دسمبر 2012ء بھی جمعہ ہی کا دن ہے۔ تو یہ بات محض اتفاق سے کہیں آگے بڑھ گئی۔ راقم الحروف کے نزدیک تمام رائج الوقت سائنسی تصورات اور تحقیقات کے صحیح ہونے کی

صرف ایک ہی شرط تھی کہ جس دن کا تعین مغربی سائنسدان اور دیگر ماہرین بطور یومِ قیامت (Doomsday) کر چکے ہیں، وہ جمعہ کے علاوہ کوئی اور دن نہ ہو۔اور جب تقویم میں دیکھا گیا تو یہ دن جمعہ ہی نکلا، جو کہ اس کتاب کے پروجیکٹ میں شامل سبھی تحقیق کاروں کیلئے ابتدائی طور پر حیرت کے جھٹکے سے کم نہ تھا۔

اس نکتہ پر پہنچ کر اب یہ بات موزوں لگتی ہے کہ جمعہ اور قیامت کے باہمی تعلق کے حوالے سے مزید دلائل دینے سے گریز کیا جائے۔لہٰذا اب یہ قارئین پر چھوڑا جا رہا ہے کہ وہ اس کتاب میں موجود تفصیلات اور دیگر دستیاب ذرائع کی مدد سے خود منطقی اور غیر متعصب نتائج پر پہنچ کر حقیقت کا ادراک کرنے کی کوشش کریں۔اس طرح قارئین خود فیصلہ کرسکیں گے کہ کتاب ہذا میں پیش کردہ ثبوتوں اور زمینی حقائق میں باہم کتنا ربط اور ہم آہنگی ہے۔

تصورِ مہدی، دجّال اور قربِ قیامت

The Mahdi, Antichrist and End of Time

مسلمانوں کے ہاں قیامت کے حوالے سے جو عمومی مزاج پایا جاتا ہے وہ تصورِ مہدی اور فتنہء دجال سے جڑا ہوا ہے۔اگر کسی عام مسلمان سے قیامت کے متعلق کچھ کہا یا پوچھا جائے تو وہ اس کو ہر مرحلہ پر ظہورِ مہدی اور خروجِ دجال سے منصوب کرتا ہوا نظر آئیگا۔اس روایتی اندازِ استدلال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس قیامت کے موضوع پر موجود ذخیرۂ حدیث کا بڑا حصہ انہی دو موضوعات کا احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔مزید برآں، اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ مدرسہ جات سے فارغ التحصیل ''جامد'' خیالات کے

حامل مقرّرین نے اِن تصوراتِ حدیث کو لغوی وظاہری معنوں میں اس حد تک عام کر دیا ہے کہ کسی بھی مرحلہ پر اصطلاحی یا استعاراتی معنی پیش کرنا گناہِ کبیرہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

قیامت پر ایمان لانا ہر مؤمن کے ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ تاہم قیامت کی جزوی تفصیلات، قربِ قیامت کے واقعات اور اس کی روایتی تشریحات پر ہو بہو ایمان لانا ہرگز ایمان کی شرائط میں شامل نہیں۔ اسلام اپنے اندر ایک عملی دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے، جبکہ اسکے برعکس دوسرے تمام مذاہب روحانی اور مسیحائی (Messianic) واقع ہوئے ہیں۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کے تصورِ قیامت کو بھی دوسرے مذاہب کے پیش کردہ مسیحائی تصوراتِ قیامت سے جدا کرنے کا باعث ہے۔

تصورِ مہدی جسے ہم عرفِ عام میں قربِ قیامت میں ظاہر ہونے والی ایک جیتی جاگتی شخصیت جان کر ''المہدی، امام مہدی اور امام المنتظر '' وغیرہ کے ناموں سے جانتے ہیں، اسلام کے تصورِ قیامت کے زینہ کی وہ پہلی سیڑھی ہے جس کا تنقیدی جائزہ لیے بغیر اس موضوع پر کوئی تحقیقی وتجدیدی بحث ممکن نہیں۔ بلا شبہ جب تک ہم ذاتی عقائد اور تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر اس معاملے کا غیر جانبدارانہ تجزیہ نہیں کرینگے ہمارے عقائد اسی طرح باہمی تضاد اور جنجال کا شکار رہیں گے۔ لہٰذا راقم الحروف نے ابہامات سے بھرپور اس معاملے کو کڑے انداز میں پرکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی اصول کے تحت ذیل میں آنے والے مضمون میں تصورِ مہدی کا تنقیدی جائزہ قرآن، تقابل ادیان اور تاریخ کی روشنی میں پیش کیا جائے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ تصور اپنی اصلی حالت (Genuineness) میں کس حد تک اسلامی اور تاریخی اعتبار سے مستند ہے۔ اس کے علاوہ ہم تاریخ اسلامی میں جھانک کر یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اسلام اور اُمتِ مسلمہ کو آج تک تصورِ مہدی نے کتنا فائدہ اور کتنا نقصان پہنچایا ہے۔

اپنے انداز ومزاج کے اعتبار سے مہدیت خالص مسیحائی عقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پراسرار فلسفہ بھی ہے۔ تمام اخلاقی وروحانی تعلیمات پر مبنی مذاہب جب دُنیوی طور غلبہ حاصل کرنے یا انسانی معاشرت کو اثر انداز کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں، تو وہ خالص روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر ایک عجیب طرز کی ''خود ساختہ کاہلی'' کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کاہلی کی بنیاد وہ ''آئیڈیلزم'' (Idealism) ہے جس کی ساری عمارت آخری مسیحا (Messiah) کی آمد کے فلسفے پر کھڑی ہے، کیونکہ ایسے آئیڈیلزم کا شکار لوگوں میں یہ عقیدہ بہت جلد پروان چڑھ جاتا ہے کہ جب تک اُن کا نجات دہندہ ''مسیحا'' اُن کے اندر ظاہر نہیں

ہو جاتا، دنیا میں حق پھیلانے کے لیے کی جانے والی اُن کی کوئی بھی کوشش کامرانی کی معراج تک نہیں پہنچ پائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحائی عقائد رکھنے والے لوگ ہاتھوں پر ہاتھ دھرے محض اسی بات کا انتظار کرتے ہیں کہ کب اللہ ان کی مدد کیلئے وہ مسیحا بھیجے، جو اُن کو فتح وکامرانی سے ہمکنار کرے۔ یہ سرطان کسی بھی محرّک قوم کو جمود کا شکار کرنے اور آفاق سے زمین پر لا پھینکنے کیلئے کافی ہے۔ جو بات ہمارے لیے یہاں لازم ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے کسی بھی عقیدہ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اُس قرآنی اصول کو نظر انداز نہ کریں، جس میں اللہ ربّ العزت نے قوموں کے عروج وزوال کا ایک چمپئین مقرر کر دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت قطعاً نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنے طرزِ زندگی کو بہتر بنانے کی سعی نہ کریں۔''

(سورۃ الرّعد ۱۳:۱۱)

یہودیت اور عیسائیت ہزار ہا سال سے اسی عقیدے پر قائم ہیں کہ اُن کا نجات دہندہ آ کر انہیں مشکلات سے نکالے گا اور بالآخر پوری دنیا میں اُن کی حکومت قائم ہوگی۔ یہودیت وہ پہلا سامی مذہب تھا، جس نے دنیوی ناکامیوں سے دلبرداشتہ ہو کر ایک مسیحائی عقیدہ متعارف کروایا۔ اس عقیدہ کے مطابق حضرت داوٗدؑ کی اولاد میں سے ایک عظیم بادشاہ نمودار ہوگا، جو حضرت داوٗدؑ کی طرح بنی اسرائیل کو ان کی عزت وحشمت واپس لوٹائے گا اور ساری دنیا پر یہودیوں کی حکومت قائم کرے گا۔ بنی اسرائیل کی 586 قبل مسیح میں بابل کے حکمران بخت نصر کے ہاتھوں شکست، ہیکل سلیمانی کی تباہی اور جلاوطنی درحقیقت وہ اصلی وجوہات تھیں، جن سے پھیلنے والی ''قومی مایوسی'' کو کم کرنے کیلئے آلِ یہود نے چھٹی صدی قبل مسیح میں ''نجات دہندہ مسیح'' کا عقیدہ اپنایا اور تب سے آج کے دن تک وہ اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔ آلِ یہود کے ہاں ہیکل سلیمانی کی تباہی کے بعد ایک مایوس کن سوچ پروان چڑھ گئی تھی کہ خدائے بنی اسرائیل ''یہواہ'' نے اُن کی سرکشی کے باعث اُن سے منہ موڑ لیا ہے، جس کی سزا بنی اسرائیل کو اُن کے مقدس ترین عبادت خانہ کی تباہی اور ''ارضِ موعودہ'' (Promised Land) سے جلاوطنی کی صورت میں ملی ہے۔ اس فکر کے جواب میں جس فکر کو عروج ملا وہ ''مسیحائی'' فکر تھی، جس میں نوید سنائی گئی تھی کہ ''یہواہ'' (یہود کی طرف سے استعمال کردہ خدا کا عبرانی نام) اُن سے ہمیشہ کے لیے ناراض نہیں ہوا، بلکہ وہ آلِ یعقوبؑ کو وقتی سزا کے بعد ایک طاقتور بادشاہ (جسے ''مسیح'' کے نام سے جانا گیا) کے ذریعے دوبارہ عروج عطا کرے گا۔

یہود کا یہ عقیدہ حضرت دانیالؑ سے منصوب صحیفہ پر مبنی ہے، کیونکہ جلاوطنی کے دور میں جو نبی بنی اسرائیل میں مبعوث کیے گئے تھے، وہ حضرت دانیالؑ ہی تھے جو کہ فارس کے شہنشاہ سائرسِ اعظم کے دربار میں وزارت کے منصب پر بھی فائز رہے۔ حضرت دانیالؑ سے منصوب یہ صحیفہ موجودہ بائبل کے عہد نامہ قدیم کے حصہ ''انبیاء'' (Hebrew *Neviim*) میں شامل ہے۔ صحیفۂ دانیال میں مذکور ہے:

''رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے سامنے کوئی کھڑا ہے جو انسان جیسا دکھائی دیتا تھا۔ وہ آسمان کے بادلوں پر آرہا تھا۔ وہ قدیم بادشاہ (خدائے یہواہ) کے پاس آیا تھا۔ اسے اس کے سامنے لے آیا گیا تھا۔ وہ شخص جو کہ انسان کی مانند دکھائی دے رہا تھا، اس کو سلطنت، حشمت اور سارا علاقہ سونپا گیا۔ سبھی قومیں اور ہر زبان کے گروہ اس کی خدمت کریں گے۔ اس کی حکومت ہمیشہ قائم رہے گی۔''

(دانیال، ۱۴-۱۳:۷)

مذکورہ بالا آیات یہودیوں کے عقیدۂ مسیح اور اُس کی ابدالآباد رہنے والی حکومت کے نظریہ کو نہ صرف جنم دیتی ہیں، بلکہ پروان بھی چڑھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہودی اپنے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ بحیثیتِ قوم خدا کے ''مقدس لوگ'' (Chosen Race) ہیں، جنہیں خدا نے چن کر اپنا بنالیا ہے اور جن کی نہ صرف ساری دنیا پر حکومت قائم ہوگی، بلکہ تمام قوموں پر ان کی فرمانبرداری اور احترام بھی لازم ہوگا۔ ان کے اس عقیدہ کی آبیاری بھی صحیفۂ دانیالؑ کی ان آیات سے ہوتی ہے، جو ذیل میں مرقوم ہیں:

''جو ہونا ہے اُس کا فیصلہ خدا کی عدالت کرے گی اور اس (کافر) بادشاہ سے اس کی حکومت چھین لی جائے گی۔ اس کی سلطنت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر خدا کے مقدس لوگ اس مملکت پر حکومت کریں گے۔ زمین کی سبھی مملکتوں کے سبھی لوگوں پر اُن کی حکومت ہوگی۔ یہ حکومت ابدالآباد تک رہے گی اور دیگر سبھی قوموں کے لوگ اُن کا احترام کریں گے اور اُن کی فرمانبرداری بھی کریں گے۔''

(دانیال، ۲۷-۲۶:۷)

عیسائیوں کا مسیحائی عقیدہ بھی بنیادی طور پر یہودیت سے ہی درآمد شدہ ہے۔ آلِ یہود نے اُس وقت حضرت عیسیٰؑ پر جھوٹے مسیح ہونے کا الزام لگا کر اُن کو مصلوب کرنا چاہا، جب اُن کی نبوّت کو شروع ہوئے محض تین سال ہوئے تھے اور اُن کی تعلیمات پوری طرح سے عام لوگوں تک نہیں پہنچیں تھیں۔ یہودیوں کے کاہنِ اعظم کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو عقیدۂ مسیح کی توہین کا مرتکب ٹھہرا کر صلیب دیئے

جانے کا فتویٰ جاری کیا گیا۔ یہودیوں کو اس معاملے میں فلسطین کے رومی گورنر ''پونٹس پائے لیٹ'' (Pontius Pilate) کی اجازت بھی مل چکی تھی کہ وہ مسیحیت کے دعویدار اس شخص کو سرکاری سطح پر سزائے موت دے کر عبرت کا نشان بنا سکیں۔ چونکہ عیسائیوں کو طوائف الملو کی کی اس کیفیت میں یہی لگا کہ حضرت عیسیٰؑ مصلوب کر دیئے گئے ہیں، اس لیے انہوں نے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی ''صلیب کے ذریعے گناہوں کے کفارہ'' (Salvation through Crucifixion) کا عقیدہ تخلیق کر لیا۔ جبکہ اس عقیدہ کی تخلیق کے پیچھے اصل واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ صلیب کے واقعہ کے تیسرے دن اُس غار سے نکلے جہاں انہیں حالتِ بے ہوشی میں فلسطینی شہر ''ارماتھیا'' کا رہائشی یوسف نامی سیاسی اثر ورسوخ کا حامل شخص صلیب سے اُتار کر لے گیا تھا، تو عیسائیوں میں اُن کے ''مردوں میں سے جی اُٹھنے'' کا نظریہ شہرت پکڑنے لگا۔ اس نظریہ کو ابتدائی طور پر متعارف کروانے والی چند ''توہم پرست'' خواتین تھیں، جنہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ''یسوع مسیح'' کے دوبارہ زندہ ہونے کی گواہ ہیں کیونکہ اُنہیں یہ بات خود یسوع نے بتائی ہے۔ جلد ہی اس نظریہ نے اتنی شہرت پکڑی کہ یہ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ بن گیا اور اس نے رائج الوقت انجیلوں اور عہد نامہ جدید کی باقی کتابوں میں جگہ بنا لی۔ عیسائی بائبل کی آخری کتاب ''مکاشفہ'' (Revelation) میں تحریر ہے:

''یسوع مسیح کی طرف سے جو سچا گواہ اور مُردوں میں سے جی اٹھنے والوں میں پہلا ہے اور دنیا کے بادشاہوں پر حاکم ہے۔''

(مکاشفہ،۵:۱)

حضرت عیسیٰؑ کا مصلوب ہو کر دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ عیسائیوں کو اُن کی دنیا میں واپسی اور ابدالآباد 'مطلق العنان' حکومت کے تصور کی طرف لے گیا۔ پہلے پہل تو صرف اِسی ''تسلی'' پر اکتفا کیا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ دنیا میں جلد واپس آئیں گے اور مومنوں کو سہارا دینگے۔ اس ابتدائی عقیدہ کی ایک شہادت ہمیں عہد نامہ جدید کی دستاویز ''کتابِ اعمال'' سے بھی دستیاب ہے، جہاں یوں مذکور ہے:

''اور وہ اُس مسیح کو جو تمہارے واسطے مقرر ہوا ہے یعنی یسوع کو بھیجے (گا)۔ ضرور ہے کہ وہ آسمان میں اُس وقت تک رہے جب تک کہ وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذِکر خُدا نے اپنے پاک نبیوں کی زُبانی کیا ہے۔''

(کتابِ اعمال، ۲۱-۲۰:۳)

تاہم نام نہاد حواری ''پولس''(Saint Paul) کے عیسائیت پر غلبہ کے بعد اُس کی تعلیمات کے زیرِ اثر ''یسوع مسیح کی واپسی'' کے عقیدہ کے ساتھ ''بادشاہتِ مسیح'' کا عقیدہ بھی منسلک کر دیا گیا۔ان دونوں عقائد نے بہت جلد عقیدۂ واحد کی شکل اختیار کر کے عیسائی عہد نامہ جدید میں جگہ بنالی۔یوحنا حواری سے منصوب عہد نامہ جدید کی سب سے آخر میں لکھی جانے والی کتاب ''مکاشفہ''، جو کہ ترتیب کے اعتبار سے بھی بائبل کی آخری کتاب ہے، میں مرقوم ہے:

''دنیا کی بادشاہی ہمارے خداوند اور اس کے مسیح کی ہوگی اور وہ ابدالآباد بادشاہی کرے گا۔''

(مکاشفہ، ۱۱:۱۵)

''مسیح یا مسیحا'' اصلاً عبرانی زبان کا لفظ ہے[1]۔جس کا معنی ہے ''بھیگے ہوئے سر والا''۔یہودیت اور عیسائیت دونوں میں اصطلاحاً اس سے مراد ''عظیم بادشاہ'' ہے۔جس کی بادشاہی ساری دنیا پر ہوگی۔یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ادیان قربِ قیامت کو ''مسیحائی عہد''(Messianic Age) کا نام دے کر اُس کی جلد آمد کی دعا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غیر سامی مذاہب کے مسیحائی تصورات پر پچھلے صفحات میں جامع بحث ہو چکی ہے۔لہٰذا یہاں اُن کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔تاہم سامی ادیان کے تصوراتِ مسیح کی اسلامی تصورِ مہدی سے گہری وابستگی کی وجہ سے یہ ضروری تھا کہ اُن کے پس منظر کا تنقیدی جائزہ لے کر تفصیلی بحث کی جائے۔اب ہم اُس نہج پر پہنچ چکے ہیں، جہاں ... نوں میں رائج تصورِ مہدی اور اس پر پڑنے والے یہودی اور عیسائی اثرات کا جائزہ لینا کافی آسان ہو گیا ہے۔

''مہدی'' عربی زبان کا لفظ ہے۔جس کے معنی ہیں ''ہدایت یافتہ''۔دینی اصطلاح میں مہدی سے مراد وہ ہستی ہے، جسے خدا کی طرف سے مستقلاً ہدایت ملتی ہو۔عرفِ عام میں مہدی کے ساتھ ''امام'' کے

1۔عبرانی میں اس کی ادائیگی ''مشیخ''(Meshiakh) ہے۔جبکہ اس لفظ کا عربی تلفظ ''مسیح''(Massih) ہے۔

سابقہ کا اضافہ کیا جاتا ہے اور اس مسیحائی ہستی کو ''امام مہدی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے

''ایسا رہبر جو خدا کی طرف سے ہدایت دیا گیا ہو۔'' خدا کا انسانیت کے نام آخری پیغام ''قرآن کھیں'' مہدی جیسی کسی بھی شخصیت کے تذکرہ سے بالکل خالی ہے۔ قرآن کھیں کی کسی آیت میں ایسا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا، جس کا حقیقی یا ضمنی رُخ ''مہدیت'' کی طرف ہو۔ مزید برآں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ حدیث کے بنیادی ماخذ صحاح سِتّہ کی مستند ترین کتاب ''جامع بخاری'' میں بھی مہدیت کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں قربِ قیامت کے واقعات پر بڑے جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا اس امر سے ایک بات جو کسی بھی ایسی بحث کو شروع کرنے سے پہلے، جس کا مدعا اثباتِ مہدیت ہو، طے ہو جاتی ہے، کہ اسلامی دینیات کے دو بنیادی ماخذوں سے تصورِ مہدیت مطلقاً غائب ہے۔ علاوہ ازیں ''صحیح مسلم'' میں بھی مہدی نام کی کسی شخصیت کا کوئی تذکرہ موجود نہیں اور نہ ہی اُن کے اُخروی دور کے کردار پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ صحیح مسلم میں قربِ قیامت کے حالات و واقعات بشمول نزولِ عیسیٰؑ وخروجِ دجّال صحیح بخاری کی نسبت زیادہ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ صحیح مسلم کی صرف ایک حدیث میں ایک ایسے خلیفہ کا ذکر ملتا ہے، جو کثرت سے خیرات کیا کرے گا۔ روایت پسند شارحین حدیث کی اکثریت اس خلیفہ کو مہدی قرار دیتی ہے۔ لیکن اس تشریح سے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا امام مسلم لفظ ''مہدی'' سے ناواقف تھے؟ یا انہوں نے جان بوجھ کر اس کو استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا؟

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے کتبِ احادیث میں جن تین کتابوں کو چمپئیور کے اعتبار سے سرِ فہرست رکھا، وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطّا امام مالک ہیں۔ موجودہ تجزیہ میں ہم پہلے ہی دو کا جائزہ لے چکے ہیں اور اب ہم امام مالک کی ''موطّا'' پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔ یہاں نتائج کے حصول کے لیے محض ایک تحقیقی نگاہ ہی کافی رہے گی۔ یہ امر دلچسپی کا حامل ہے کہ موطّا امام مالک میں بھی مہدیت یا مسیحائی خلیفہ جیسے کسی تصور کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ ان تینوں کتبِ احادیث میں زمانی اعتبار سے موطّا امام مالک سب سے پہلے لکھی گئی۔ صحیح بخاری دوسرے نمبر پر وجود میں آئی۔ جبکہ صحیح مسلم کی تدوین ان تینوں میں سب سے آخر میں عمل میں آئی۔ قابلِ توجہ بات جو اِن تینوں کتب میں یکساں پائی جاتی ہے وہ تصورِ مہدی کا اِن تینوں کے متن سے یکسر غائب ہونا ہے۔ جبکہ قرآن بھی اِن سے پہلے بالکل اسی نقطۂ نظر کو اپناتا ہوا نظر آتا ہے۔ منطقی انداز سے دیکھا جائے تو تاریخ جمع حدیث کے حوالے سے دو طرح کی آراء قائم کی جا سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ تصورِ مہدی پر مبنی احادیث کا جمعِ حدیث کے اوائل دور میں کہیں کوئی وجود نہیں تھا۔ یعنی ایسی تمام

احادیث کو بعد میں ’’ضرورت ایجاد کی ماں ہے‘‘ کے محاورے کے مصداق گھڑ لیا گیا۔ دوّم، اگر معاملہ یوں نہیں اور یہ کہ مہدیت کا پرچار کرنے والی احادیث واقعتاً پہلے سے موجود تھیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تین جیّد محدثین جو کہ فن حدیث کے امام تصور کیے جاتے ہیں اور جن کے ذخیرۂ حدیث پر علم الحدیث کی پوری عمارت کھڑی ہے، اُن احادیث سے مکمل ناواقف رہے جو مہدیت کا پرچار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس معاملہ میں جو دوسری صورت ممکن ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں محدثین نے ایسی تمام احادیث کو متن یا سند کے اعتبار سے قابلِ اعتماد نہیں سمجھا۔ ایسی صورت میں ہم یہ سوال اٹھانے میں حق بجانب ہیں کہ بعد کے محدثین نے کیوں اور کن بنیادوں پر بانیانِ علم الحدیث کی مسترد کردہ احادیث کو صحیح تسلیم کر لیا؟

راقم الحروف کی ذاتی رائے کے مطابق پہلی صورت زیادہ متوقع دکھائی دیتی ہے اور یہ کہ ایسی تمام احادیث، جن میں مہدیت کا تذکرہ موجود ہے، بعد کی پیداوار ہیں اور سرے سے احادیث ہیں ہی نہیں۔ اس بات کی سند خود حدیث سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

’’حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد کے زمانہ میں بہت سے جھوٹے اور مکار لوگ پیدا ہو جائیں گے۔ وہ تمھیں (مجھ سے منسوب) باتیں سنائیں گے، جو تم نے کبھی نہ سنی ہوں گی۔ نہ تمھارے باپ دادا نے سنی ہوں گی۔ تم ان سے بچنا۔‘‘

(صحیح مسلم)

یہ تاریخی طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شام میں رہنے والے یمنیٰن اپنے یہودی وعیسائی پس منظر کے علاوہ بائبلی (Biblical) عقائد کے زیرِ سایہ رہ کر تصورِ مسیحا سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ جلد ہی اُنہیں یہ تصور اپنا اپنا سا لگنے لگا اور اُن کی مسیحا (Savior) کیلئے تشنگی بڑھنے لگی۔ ایسی حالت میں اسلامی تعلیمات کے اندر ’’خدائی نجات دہندہ‘‘ کی طرز کی تعلیمات کے لیے گنجائش نہ پا کر اکثر یمنیٰنوں کو مایوسی ہوئی۔ مزید ستم یہ کہ عبداللہ ابن سباء اور اُس کے اسلام دشمن شریر ٹولے نے بھی ایسے ہی گمراہ کن عقائد پھیلانا شروع کر دیئے، جو کہ اسلام کی فطرت کے خلاف ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر دیئے گئے۔ ایسے عقائدِ باطلہ میں سے اکثر کی کڑیاں جہاں ایک طرف رسول اللہ ﷺ سے ملتی تھیں، تو دوسری طرف اس کا ناطہ عقیدۂ مہدیت کی ابتدائی شکل (Prototype Mahdism) سے جوڑا جاتا۔ اور یوں اُس تصور کا جنم ہوا، جس نے بعد میں امتِ مسلمہ کو پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا اور مسلم اُمّہ آج

تک اس کو سچ مان کر سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مہدیت کا پیروکار ایک مضبوط مکتبہ فکر (School of Mahdism) وجود میں آیا، بلکہ اسلام کے اندر بنیادی ماخذوں کو نظرانداز کرتے ہوئے End of Times اور Apocalypse کی ایک نئی روایت نے تشکیل پا کر مسلم اُمّہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے سحر میں لے لیا۔

اب ہم موجودہ بحث کے ضمن میں دوسرا سوال اٹھائیں گے۔ یہ سوال ''مہدیت'' کو قرآنی تعلیمات کے میزان پر تولنے اور اس تصور کی Higher Criticism کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے مہدیت کو سچ مان بھی لیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''مہدی'' نامی اس پُراسرار شخصیت کی دینی و شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا کہ وہ (جس طرح کہ مذہب شیعہ کا ماننا ہے) ''ودیعی امام'' ہوں گے اور خدا سے براہِ راست ہدایت وصول کریں گے؟ اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو اگلا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام نے ''امامت بالودیعت'' جیسے کسی تصور کی گنجائش باقی رکھی ہے؟ کیا قرآن اس پر بحث کرتا اور اس کے حق میں دلائل دیتا ہوا نظر آتا ہے؟ امام کون ہوتا ہے اور وہ نبی کے درجے سے کس قدر قریب، بلند یا پست ہوتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن وُسنت اور سیرت کے عرق ریز مطالعہ کے بعد بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات میں کسی بھی جگہ ''امام الامت'' جیسے کسی منصب، مرتبہ یا مظہر کو متعارف نہیں کروایا گیا۔ پھر کیونکر زبانِ رسول ﷺ ایک غیر اسلامی فکر کی تبلیغ کر سکتی ہے؟

مزید آگے بڑھتے ہوئے ہم مہدی کے بارے میں رائج کچھ دوسرے عقائد کو بھی ایک نظر دیکھتے ہیں۔ علماء کے ایک مکتب کا خیال ہے کہ مہدی خلیفہ راشد ہوں گے اور دین کی تجدید کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ یہاں ہمیں منطقی بنیادوں پر ایک سوال اُٹھانا چاہیے کہ کیا مہدی منصبِ شریعہ کے اعتبار سے محض ایک مجدد اور خلیفۃ المسلمین ہی ہوں گے؟ اگر ایسا ہوگا تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ سے بغیر کسی درمیانی واسطہ کے براہِ راست راہنمائی حاصل کر سکیں؟ کیا خلفائے راشدین (ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم) جو کہ ''اصحابِ رسول'' بھی تھے، میں سے کسی کو حق تعالیٰ کی طرف سے کبھی بلاواسطہ ہدایت وراہنمائی عطا کی گئی؟ توحید کے بعد سب سے اہم قرآنی اصول ''وحی'' کا وہ تصور ہے جس کے مطابق اللہ کی طرف سے براہِ راست راہنمائی صرف انبیاءؑ کو ہی دی جاسکتی ہے، جبکہ ''بلاواسطہ ربط یا رابطہ'' کا یہ سلسلہ بھی حضرت محمد ﷺ کی ہستی پر موقوف ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اُن کے بعد کسی کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ ہدایتِ الٰہی سے بہرہ

ورتھا، ہے یا ہوگا درحقیقت تعلیماتِ قرآنی کی نفی کے مترادف ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ ''مہدیت'' کے تصور کی بنیاد ہی ''اُلوہی ہدایت'' پر ہے اور روایتی عقیدہ کے مطابق ''مہدی'' کے لقب سے ملقّب یہ شخص ہدایتِ الٰہی کے تابع تمام امور سرانجام دے گا۔ کیا اب بھی اس بات میں کوئی شک باقی ہے کہ اِس نکتہ پر قرآنی اصول اور مروّجہ تصورِ مہدیت باہم متصادم نہیں؟ کیا یہ تصادم محض بادی النظر میں تصادم محسوس ہوتا ہے یا معاملہ اس سے کہیں آگے بڑھ جاتا ہے؟ مزید برآں جو ''الوہی صفت'' شخصیتِ مہدی میں ڈال دی گئی ہے، وہ اُن کا اسم گرامی ہے۔ معروف روایات کے مطابق اُن کا نام ''محمد بن عبداللہ'' ہوگا اور وہ لگ بھگ اُنہی صفات کے حامل ہوں گے، جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں موجود تھیں۔ تو کیا ہم اُلوہی ہدایت سے فیض یاب مہدیت کا اقرار کرنے کے بعد بھی واقعتاً ''ختمِ نبوّت'' پر یقین رکھتے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنی سنت تبدیل کرے گا اور اولیاء، اوصیاء یا آئمہ کو وحی کر کے رشد و ہدایت سے نوازنا شروع کر دے گا؟ مہدی کا منصب آخر کیا ہوگا؟ اگر تو وہ اللہ کی طرف سے اٹھائے گئے خلیفہ ہوں گے تو اشکال یہ سامنے آتی ہے کہ اللہ اُنہیں کس کے ذریعے مامور کرے گا؟ مروّجہ عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا نزول ظہورِ مہدی کے واقعہ کے بعد پیش آئے گا، یعنی مہدی خلیفۃ اللہ مامور کیے جا چکے ہوں گے۔

دراصل قرآن کا ''خاتم الوحی'' اور آنحضرت ﷺ کا ''خاتم النبیین'' ہونا وہ نصوص واصولِ قرآنی ہیں جنہوں نے آئندہ باتوں کو خدا کی طرف منصوب کرنے کے تمام راستے بند کر دیئے۔ تاہم کوئی چارانہ ہونے کے باوجود عالمِ بالا سے ربط بحال رکھنے کی خواہش کے تحت جلد یا بدیر اہلِ تصوّف نے ''ہاتفِ غیبی''، اہلِ سنت وحدیث نے ''مجدد و مہدی'' اور اہلِ تشیع نے ''امامتِ و دایعہ اور وصی الرّسولؐ'' کے نظریات کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ آگے چل کر اِن تینوں نظریات نے مضبوط مذہبی روایات کی شکل اختیار کر لی اور تین طرح کے فرقوں کو جنم دیا۔

اگلا نکتہ خوش فہمی پر مبنی اُس تصور کے حوالے سے ہے جس کے مطابق مہدی کی آمد کے بعد ساری دنیا میں ''ایمان'' (درحقیقت اسلام) پھیل جائیگا اور کفر و برائی مطلقاً ختم ہو جائیں گے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ اہلِ عقل و دانش اتنا بھی سوچنے سے قاصر ہیں کہ کفر و برائی اگر نبی آخر الزماں ﷺ کی زندگی اور دورِ نبوّت میں مطلقاً ختم نہیں کیے گئے تو یہ کسی اور شخصیت کے دور میں مکمل طور پر کیسے مٹائے جا سکتے ہیں؟ حضرت محمد ﷺ نہ صرف خاتم الانبیاءؑ ہیں، بلکہ آپ ﷺ سید البشر اور انسانیت کے تمام پہلوؤں کی اپنے

اندر تکمیل بھی ہیں۔ انسانیت، ایمان، نیکی اور فلاح نے رسول اللہﷺ کی شخصیت پر آ کر اپنی اپنی معراج دیکھی۔ جبکہ اس ضمن میں آپﷺ کا اپنا فرمانِ ذیشان بھی ہے کہ ''سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر اس کے بعد کے لوگوں کا، پھر اس کے بعد کے لوگوں کا۔'' اِن تمام صورتوں اور اسلام کی کھلی کھلی تعلیمات کو سامنے رکھ کر غیر جانبدارانہ مطالعہ کے بعد بھی کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام مہدی اس بات کے رسول اللہﷺ سے بھی زیادہ مستحق ہیں کہ اُن کے دور میں کفر و برائی کا مطلق خاتمہ ہو؟ اللہ ربّ العزت نے کائنات کی جو منصوبہ بندی کی ہے، اس میں ''محمدﷺ'' سے بہتر کوئی شخص نہیں اور نہ ہی کوئی اس بات کا آپﷺ سے زیادہ مستحق ہے کہ وہ زمین پر خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز ہو کر شیطان کو ذلیل و خوار کرنے اور تمام عالمِ انسانیت کو یکجا ن کر کے خدا کے حضور سجدہ ریز کرنے کا معجزہ سرانجام دے سکے۔ اگر اللہ نے یہ اعزاز اپنے محبوب کو نہیں بخشا تو وہ کسی اور کو یہ اعزاز کیونکر بخشے گا؟

اسلامی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ امتِ مسلمہ کی سالمیت، ساکھ اور اتحاد کو جس قدر نقصان ''مہدیت'' کے تصور نے پہنچایا ہے، اتنا کسی اور عقیدے یا تصور نے انفرادی طور پر نہیں پہنچایا۔ مہدیت کے نام پر بے انتہا قتل و غارت کی گئی، امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور بہت سے ایسے فتنے اُٹھے کہ پھر دبائے نہ جا سکے اور یکجا ن آج تک اُن سے نبرد آزما ہیں۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں ایران میں ''بہاء اللہ'' نے مہدیِ چشتیاد ہونے کا دعویٰ کر کے ''بہائیت'' نامی عالمگیر مذہب کی بنیاد رکھی۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ اُس پر خدا طرف سے وحی آتی ہے اور یہ کہ وہ مہدی مقرر کر دیا گیا۔ بہاء اللہ نے نہ صرف اسلام سے اپنا ناطہ توڑ لیا، بلکہ اسلام کو منسوخ قرار دے دیا۔ آج بہائیت کے پیروکاروں کی اچھی خاصی تعداد ایران اور دیگر ممالک میں موجود ہے اور وہ بہاء اللہ کے الہامات کو مانتے ہیں۔ جو کہ ''کتابِ بہاء'' کی صورت میں اکٹھے کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنیسویں صدی ہی کے آخر میں برصغیر میں ایک ایسا فتنہ اٹھا جسے ہم ''فتنۂ قادیانیت'' کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ وہ فتنہ ہے جس نے برصغیر میں اسلام کی ایک ہزار سال پرانی جڑوں تک کو ہلا کر رکھ دیا۔ قادیان کے مرزا غلام احمد نے انتہائی مکاری کے ساتھ جس عقیدے کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا وہ بھی ''مہدیت'' ہی ہے۔ مرچھیکان نے کمال مہارت سے تصورِ مہدیت کی دلفریب تشریحات کیں اور حقائق اور چند غیر معروف احادیث کو توڑ مروڑ کر یوں پیش کیا کہ خود ہی مہدی بن بیٹھا۔ اس کی مہدیت کی کہانی اگرچہ یہیں ختم نہ ہوئی بلکہ وہ ''مسیح موعود، ظلی، بروزی اور غیر تشریحی'' نبی تک

بنا۔ تاہم مرزا چھیکان کو شیطانی منصوبہ بندی کیلئے بنیادیں فراہم کرنے والا نکتہ مہدیت ہی کا تصور تھا۔ مرزائیت یا قادیانیت اگر چہ اپنی موت آپ مرنے والی ہے کیونکہ مرزا چھیکان وکذاب کی تقریباً نوے فیصد پیشین گوئیاں جھوٹ ثابت ہو چکی ہیں۔ لیکن اس بات سے قطع نظر جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ جس عقیدہ کی بنیاد پر فتنہ کی اتنی بڑی عمارت کھڑی کی گئی، وہ مہدی کی مسیحائی ہستی کی قربِ قیامت میں آمد پر ایمان ہے، جس کو سند نہ تو قرآن پاک سے حاصل ہے اور نہ ہی حدیث کی درجہ اوّل کی کوئی کتاب اس کی وکالت کرتی ہے۔ قادیانیوں کے لاہوری گروپ کا کہنا ہے کہ وہ مرزا چھیکان کو نبی نہیں بلکہ محض ''مہدی'' مانتے ہیں۔ یعنی یہاں بھی کمند آ کر ''مہدیت'' پر ہی ٹوٹتی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر قابل تفتیش بات اور کیا ہوگی کہ مہدیت کا تصور بجائے تعمیرِ اُمت کے تخریبِ اُمت اور فتنہ وفساد کا باعث بنتا آیا ہے۔

اب ہم ماضی بعید سے مہدیت کے کچھ آثار تلاش کرتے ہیں۔ ''مہدیِ من اللہ'' ہونے کے دعووں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ساتویں صدی ہی میں عراق سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں، جن میں مختار بن ابی عبید ثقفی معروف ہے، نے حضرت علیؓ کے بیٹے ''ابن الحنیفیہ'' کو خلافتِ بنواُمیہ کے خلاف جہاد کی وجہ سے خدا کی طرف سے مامور خلیفہ مان لیا (687ء)۔ تصورِ مہدیت کی ترقی یافتہ صورت ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ تاہم اُن لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ''اہل بیت'' کے افراد خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہوتے ہیں۔ ابن الحنیفیہ کو مہدی ماننے والے زیادہ تر لوگ مذہبِ شیعہ کی ابتدائی شکل سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم وہ شیعہ اثنائے عشریہ، زیدیہ یا اسماعیلیہ نہ تھے اور نہ ہی اُس وقت تک حضرت جعفرالصادقؒ سے منصوب ''فقہ جعفریہ'' کا کوئی وجود تھا۔ یہ سب شیعت کی تاخیری شکلیں ہیں۔ اِس تاریخی حوالہ کی وجہ سے اثنائے عشریہ مکتبہ فکر کے اُس دعویٰ کو بھی دھچکا لگتا ہے کہ مہدی بارہویں امام ہیں اور زندہ ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی میں ''سید محمد جون پوری'' نے مہدیت کا دعویٰ کیا اور اپنے ماننے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت قائم کر لی۔ یہ صاحب بھارت کے موجودہ صوبہ اُتر پردیش سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کا مزار افغانستان میں ہے۔ علاوہ ازیں 1882ء میں سوڈان سے تعلق رکھنے والے ''صوفی محمد احمد'' نے دعویٰ کیا کہ وہ ''امام مہدی'' ہے۔ صوفی محمد احمد نے اپنے پیروکاروں کی مدد سے سلطنتِ عثمانیہ تک کی فوجی قوت کو پچھاڑ ڈالا اور اپنی علیحدہ ریاست قائم کر لی۔ سوڈان اُس وقت سلطنتِ عثمانیہ کا صوبہ تھا۔ صوفی محمد احمد کی ''مہدی ریاست'' 1899ء تک قائم رہی۔ تاریخی اعتبار سے مہدیت کا جو قریب ترین دعویٰ کیا گیا وہ

بیسویں صدی میں سامنے آیا۔اس واقعہ نے عالمی شہرت اور توجہ بھی حاصل کی۔''محمد عبداللہ القریشی'' نامی شخص کی طرف سے 1970ء کی دہائی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ اللہ کی جانب سے مہدی مامور کر دیا گیا ہے۔ محمد عبداللہ کے رشتہ دار'' جوہیمن بن محمد عتیبی'' نے سینکڑوں مسلح افراد کی مدد سے 1979ء میں خانہ کعبہ پر قبضہ کرلیا۔جس کے نتیجے میں کعبۃ اللہ کی حدود کے اندر فوجی آپریشن کیا گیا۔اس فوجی آپریشن میں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔واضح ہو کہ یہ فوجی آپریشن افواج پاکستان کے کمانڈوز نے کیا، جبکہ فرانس نے تکنیکی مدد فراہم کی۔گرفتار شدگان کو سعودی حکومت کے حوالے کر دیا گیا۔

مہدیت کے اس کے علاوہ بھی درجنوں دعوے کیے گئے۔تاہم اُن سب کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔اب وقت آچکا ہے کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے اور یہ جانا جائے کہ مہدیت کا تصور کہاں سے آیا اور یہ کہ اِس تصور پر مبنی عقیدہ نے اُمتِ مسلمہ کو نقصان اور خون خرابہ کے سوا اور کیا کچھ دیا؟ بلاشبہ اسلام کا پیش کردہ تصورِ قیامت مہدیت جیسے غیر عملی نظریات کا قطعاً محتاج نہیں۔

نزولِ مسیح اور فتنۂ دجال

The Second Coming of Christ & the Antichrist Turmoil

پچھلے صفحات میں پیش کردہ تصورِ مہدیت کے تنقیدی جائزہ سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس کتاب کے اگلے مرحلے میں نزولِ مسیحؑ کے امکان کا بھی مکمل استرداد کر دیا جائے۔ ہماری موجودہ بحث عقل و خرد سے زیادہ قرآن اور مستند کتبِ احادیث میں موجود تعلیماتِ نبویؐ پر مبنی ہے۔اور جو عقائد ان بنیادی ماخذوں سے اخذ کیے گئے ہیں، اُن سے انکار کسی طور ممکن نہیں۔تاہم اس ضمن میں دورِ جدید کے محققین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے الفاظ کی ''لفظی'' کے علاوہ ''اصطلاحی'' اور دیگر تمام ممکنہ تشریحات، جو سیاق و سباق سے متفق ہوں، کر سکیں۔مثال کے طور پر احادیث نبویؐ میں قربِ قیامت کے دور کی جنگوں میں جس

ہتھیار کے استعمال کی بات کی گئی ہے، وہ ''تلوار'' ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عصر حاضر کی مادی تہذیب اپنی تکنیکی و سائنسی ترقی کی بدولت پورے کرۂ ارض کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ اگر کوئی مشین امریکہ میں تیار کی جاتی ہے تو اُس کے پرزہ جات آسٹریلیا اور چین میں بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں چلنے والا ٹی وی چینل پاکستان میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ کی بدولت ساری دنیا سکڑ کر ہماری کمپیوٹر سکرین میں آ گئی ہے۔ انسان کی ناقابلِ یقین ترقی کو دیکھ کر مرزا غالبؔ کا ایک شعر بار بار ذہن میں آتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا میرے آگے　　　ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

آج ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ قیامت جیسے آفاقی حادثہ کے بغیر موجودہ تہذیب کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں۔ ماضی کی تہذیبیں محدود حدودِ اربعہ کی حامل ہوا کرتی تھیں اور وقت کے خلاف اُن کی قوت مدافعت بھی بہت کم تھی۔ تاریخ اُٹھا کر دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور یورپی نشاۃ الثانیہ سے پہلے کی تہذیبیں عموماً اپنی اندرونی ناپائیداری کے باعث بہت جلد سقوط کا شکار ہو کر گردشِ زمانہ میں گم ہو جایا کرتی تھیں۔ تاہم جدید تہذیب کسی بھی اعتبار سے اتنی ناپائیدار نہیں کہ اس کے یوں مٹ جانے کا خدشہ ہو۔ مزید برآں اگر آج عالمگیر ایٹمی جنگ بھی چھڑ جاتی ہے یا ہماری دنیا کسی شدید نوعیت کے قدرتی حادثے کا شکار ہو جاتی ہے تو بھی اِس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ دورِ جدید کی عالمگیر تہذیب کلیۃً چہرۂ ارض سے مٹ جائے۔ لہٰذا یہ بات تو طے ہے کہ عصر حاضر کا انسان پھر سے پتھر کے زمانے میں جانے کے خوف سے مکمل طور پر آزاد ہو چکا ہے اور اب ایسا کسی صورت بھی ممکن نہیں کہ انسان کو پھر سے کبھی تلوار کے استعمال کی نوبت پیش آئے۔ چونکہ احادیث نبویؐ تلوار کا لفظ استعمال کرتی نظر آتی ہیں، اس لیے ہمیں پورے معاملہ کی فکری تعمیرِ نو کرنا ہوگی۔ تو کیا ہم ایک ایسی چیز کو جو کہ آج کے دور میں مستعمل ہی نہیں بجائے خود تضاد سمجھیں یا غلط معلومات یا پھر اِس سے مراد ایک ایسے انفرادی ہتھیار کو لیا جائے، جس کی استعاراتی تشریح فی زمانہ ممکن ہو؟ ٹ ت تلوار کے استعمال کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ تلوار کا لفظ علامتی طور پر اُس ہتھیار کیلئے استعمال کیا گیا ہے جو عصر حاضر کی سپاہ کے ہر رُکن کیلئے لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی میں چونکہ سب سے اہم انفرادی ہتھیار جو دورانِ جنگ استعمال کیا جاتا تھا تلوار ہی تھا۔ اس لیے ہم استدلال کر سکتے ہیں کہ آج کے دور میں ''بندوق'' تلوار والا کردار ادا کر رہی ہے، کیونکہ دورِ جدید کی جنگوں میں ہر سپاہی کیلئے بندوق بنیادی جنگی ہتھیار ہے۔ مزید برآں اگر تیر کمان کا متبادل دیکھا

جائے تو بڑی جسامت کی مشین گنوں (MGs) کی صورت میں بالکل اُسی نہج پر کام کرنے والا ہتھیار موجود ہے۔ اور اگر نیزے کی جدید تشریح کی جائے تو ہینڈ گرنیڈ پر یہ علامت صادق آتی ہے۔ گھوڑے سے مراد ٹینک یا بکتر بند گاڑی ہوسکتی ہے، جن پر سوار سپاہ میدان جنگ میں نسبتاً بینتے ظر رہتی ہے۔ موجودہ بحث میں یہ امر واضح ہے کہ اس تشریح میں ہتھیار از خود بنیادی نکتہ نہیں، بلکہ تشریح کی بنیاد وہ اصول ہے جس کے تحت اِن ہتھیاروں کے کردار اور اہمیت کی تعریف کی جاتی ہے۔

قربِ قیامت (Apocalypse) پر تحقیق کے لیے ایک اور اہم اصول جو قیامت کے مطالعہ کاروں کے ہاں رائج ہے، وہ یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں رائج تمام پیشگوئیوں کو (قطع نظر اس کے کہ اُن کا تعلق کس مذہب سے ہے) علامتی و استعاراتی انداز سے سمجھا اور بیان کیا جائے۔ اِس اصول کو اپنانے کا جو مقصد بظاہر سامنے آتا ہے، وہ اِس بات کے سوا کچھ نہیں کہ چونکہ زمانۂ قدیم کے لوگ اُس ماحول سے قطعاً ناواقف تھے جس کے بارے میں پیشگوئیاں کی گئیں۔ لہٰذا انبیاء اور دیگر پیشگوؤں (Prophesiers) نے ایسی کوئی منظر کشی نہیں کی، جس سے مخاطبین اچنبھے کا شکار ہو جائیں۔ بلاشبہ ماضی کا انسان ٹینک، ہوائی جہاز، مشین گن، توپ، آبدوز، بیلسٹک میزائل، کروز میزائل اور ایٹم بم نامی تباہ کن ہتھیاروں کا ادراک اپنے تحت الشعور کے کروڑویں حصے میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن لوگوں سے قربِ قیامت کے واقعات پر مبنی باتیں بالکل اُسی پیرائے میں کی گئیں، جس کو سمجھنے میں انہیں کوئی دُشواری نہ ہو۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو علاماتِ قیامت بالکل اُسی انداز میں بیان فرمائیں، جو ساتویں صدی عیسوی کے عرب معاشرے میں رہنے والے کسی ذہین ترین انسان کے عقل و شعور سے متصادم نہ تھا۔ پھر صحابہؓ نے اس امانت کو بڑی احتیاط اور اہتمام کے ساتھ اگلی نسلوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا۔

اس تمہیدی گفتگو کے پس منظر میں یہ مقصد کارفرما تھا کہ اِس بات کو حالات و واقعات کی روشنی میں طے کر لیا جائے کہ ''نزولِ مسیحؑ'' اور ''فتنۂ دجال'' کا زمانہ درحقیقت موجودہ عہد ہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ احادیثِ نبویؐ میں مذکورہ بالا دونوں واقعات کی جو علامات بیان کی گئی ہیں، وہ استعاراتی انداز میں آج ہی کے زمانے پر پوری ہوتی نظر آتی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں انسان جس حد تک ترقی کر چکا ہے، اب اِس سے آگے مزید ترقی ممکن نظر نہیں آتی۔ عالمِ رنگ و بُو کا ایک ناقابلِ تبدیل

اصول ہے کہ ''ہر عروج کو زوال ہے''، اور اسی اصول کے تحت موجودہ ترقی جو کہ اپنی معراج پر کھڑی ہے کی تنزلی کا سفر کسی بھی لمحے شروع ہو سکتا ہے۔ تاہم ماضی کے برعکس یہ زوال وقتی نہیں، بلکہ حتمی ہوگا، اور انسان اِس کے بعد دوبارہ کبھی اُٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ مادی ترقی کی عالمگیر تہذیب کے زوال کیلئے واقعات و حادثات بھی اُسی پیمانے پر ہونے چاہئیں جن کا اثر عالمگیر سطح پر محسوس کیا جائے اور جو ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیں۔ ٹ ت ایسا ہونا شروع ہو چکا ہے۔ اِس طرح کے واقعات کی پہلی مثال نومبر 1989ء میں ''دیوارِ برلن'' کا گرنا ہے، جو کہ سیاسی حلقوں میں سوویت یونین اور اس کے اشتراکی نظام (Communism) کے انہدام کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرز کا ایک اور واقعہ 11 ستمبر 2001ء کو امریکی ورلڈ ٹریڈ سنٹر (WTC) اور پینٹا گون (Pentagon) پر دہشت گرد حملوں کی صورت میں پیش آیا اور اِس کا اثر دنیا بھر میں گہرائی تک محسوس کیا گیا۔

احادیث نبویؐ میں قربِ قیامت کے جن واقعات کو بیان کیا گیا ہے وہ اپنے سیاق سباق میں علاقائیت کی بجائے عالمگیریت کا عنصر اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کا نزول بلاشبہ ایک عالمگیر واقعہ ہوگا۔ جس کا براہِ راست اثر تین عالمگیر مذاہب کے پیروکاروں پر پڑے گا اور وہ تین کی بجائے دو گروہوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ (الف) حضرت عیسیٰؑ کے مقتدی بن جائیں گے اور (ب) آپؑ کے مخالفین بن جائیں گے۔ مخالفین کا یہی طبقہ ''دجالی کیمپ'' (Antichrist Camp) کی نمائندگی کرے گا اور یوں دنیا ایک باقاعدہ اصول کے تحت دو حصوں میں بٹ جائیگی۔ ہم اس موقع پر معاملات کی زیادہ گہرائی میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ علاماتِ قیامت اور تصورِ قیامت کے موضوعات پر ایک علیحدہ باب میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ تاہم اگلے صفحات میں اس بات کا جائزہ تحقیقی انداز میں لیا جائیگا کہ نزول مسیحؑ اور فتنہ دجال کی موجودہ تناظر میں نوعیت کیا ہوگی؟

بیت ن، عیسائی اور یہودی دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ساٹھ فیصد (60%) ہیں۔ جبکہ باقی مذاہب اور اُن کے پیروکار عالمی سیاسی، معاشی اور مذہبی اُفق پر اس حد تک موثر بھی نہیں، جس سطح پر یہ تینوں ابراہیمی مذاہب موثر اور اِن کے ماننے والے عالمی منظرنامے پر تحرک کا باعث ہیں۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا براہِ راست اثر دنیا کی اِس 60% آبادی سے تعلق رکھنے والے افراد پر ہوگا، جو یا تو فوراً ایمان لے آئیں گے یا پھر کافر قرار پائیں گے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

''اہل کتاب میں ایک بھی ایسا نہ بچے گا، جو حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے اُن پر ایمان نہ لا چکے اور قیامت کے دن وہ (عیسیٰؑ) اُن پر گواہ ہوں گے۔''

(سورہ نساء،۴:۱۵۹)

یہ آیت نزول مسیح کے عقیدہ کو بنیاد فراہم کرتی ہے۔ بلا شک وشبہ حضرت عیسیٰؑ کے (بعد از نزول) اُخروی کردار پر مبنی ہر بحث کا آغاز اسی نصِ قرآنی کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے۔ مزید برآں جتنی بھی احادیث حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے موضوع پر کتبِ حدیث میں موجود ہیں اُن سب کو یہی آیت تحفظ (Legitimacy) فراہم کرتی ہے۔ کیونکہ کسی بھی موضوع کا احادیث میں بکثرت پایا جانا اور اُس کا قرآن میں محض ہلکا سا اشارہ ہی مل جانا دراصل اُس موضوع کو دینیاتی طور پر متوازن کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے سلسلے میں احادیث اس کثرت سے وارد ہوئی ہیں کہ اُن کو ''متواتر'' کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے اُن کا انکار تحقیقی اعتبار سے ناممکن ہے۔ اسی سلسلے میں ایک کثرت سے روایت کی گئی حدیث ذیل میں درج کی جا رہی ہے، جس کو شیخین (بخاری ومسلم) نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد اور اس کے بعد ان کے کردار پر جامع انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ ایسا ضرور ہوگا کہ ابن مریمؑ تم میں نازل ہوں، جو کہ منصف حاکم ہوں گے۔ وہ صلیب توڑ دیں گے اور دین اسلام کو سر بلند کریں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ لینا بند کر دیں گے۔ مال کی بہتات ہوگی۔ حتیٰ کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ایک سجدہ ساری دُنیا اور جو کچھ اِس میں ہے، سے بہتر ہوگا۔''

(متفق علیہ)

نزول مسیح کے تصور کو سمجھنے کیلئے لازمی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے والے نکتے کو پہلے پرکھا اور سمجھا جائے۔ اگر یہ عقیدہ قرآن پاک سے باہر محض کتبِ حدیث میں موجود ہوتا تو اِس پر تحقیقی اسالیب کے اصولوں کے مطابق اعتراضات ممکن تھے۔ لیکن چونکہ اس امر کی وضاحت اللہ ربّ العزت نے خود قرآن میں فرما دی ہے کہ عیسیٰؑ زندہ آسمان پر اُٹھا لیے گئے ہیں۔ اس لیے اس پر کوئی عقلی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ منطق کی رُو سے حضرت عیسیٰؑ کی زندہ زمین پر واپسی کیلئے سب سے اہم شرط بھی یہی ہے کہ وہ زندہ

ہی آسمان پر اٹھائے گئے ہوں۔عیسائی بھی حضرت عیسیٰؑ کی زمین پر واپسی، اُن کا اہلِ زمین پر حکومت کرنا اور تمام اقوامِ عالم کو (عیسوی) ایمان پر اکٹھے کرنے کو مانتے ہیں۔لیکن اسلام سے اُن کے جو دو بنیادی اختلافات ہیں، وہ یہ ہیں کہ --پولس (Saint Paul) کے بقول-- حضرت عیسیٰؑ انسانی گناہوں کے کفارہ کیلئے مصلوب ہوئے تھے۔اور یہ کہ وہ اپنی موت کے تیسرے دن جی اٹھے تھے۔جس کے بعد لگ بھگ چالیس دن وہ زمین پر رہے اور پھر آسمان پر اٹھا لیے گئے۔چالیس دن زمین پر رہنے کا تذکرہ لوقا کی انجیل میں ہے۔جبکہ باقی تینوں انجیلوں کے مصنفین اس امر پر باہمی اختلاف رکھتے ہیں۔مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ کو محفوظ رکھا اور وہ صلیب پر مرے نہیں اور نہ ہی اُن کو کسی اور ذریعہ سے قتل کیا گیا۔وہ ہر طرف اور ہر طرح سے محفوظ رہے اور بعد میں آسمانوں پر اٹھا لیے گئے۔یہاں واضح یہ ہوا کہ مسلمان اُن کے زندہ اٹھائے جانے، زندہ واپسی اور بالآخر طبعی وفات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔جبکہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے صلیب پر قتل ہونے، حالتِ موت سے دوبارہ زندہ ہونے، آسمان پر اٹھائے جانے، قربِ قیامت میں اُن کی واپسی اور اُس کے بعد ہمیشہ زندہ رہ کر بادشاہت کرنے کے عقیدہ پر قائم ہیں۔قرآن کریم کا اِس متنازع معاملہ پر موقف بہت واضح ہے۔ارشادِ ربّانی ہے:

''اُن (یہود) کا کہنا ہے کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ مسیح ابن مریمؑ کو قتل کیا۔حالانکہ نہ تو انہوں نے اُن کو قتل کیا (اور) نہ سولی پر چڑھایا۔ بلکہ معاملہ اُن پر مشتبہ کر دیا گیا۔یقیناً (حضرت) عیسیٰؑ کے بارے میں اختلاف کرنے والے شک میں ہیں۔اُنہیں اِس کا کچھ یقین نہیں، بجز اندازوں پر عمل کرنے کے۔یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے اُن (حضرت عیسیٰؑ) کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی طرف اٹھالیا۔اور اللہ بڑا زبردست اور حکمتوں والا ہے۔''

(سورۃ النساء،۴:۱۵۷،۱۵۸)

دوسرا بنیادی فرق جو مسلمان اور عیسائی عقائد کے درمیان ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے بعد اُن کے ہاتھ پر اہلِ دنیا کے مسلمان ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔جبکہ عیسائیوں کا ماننا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دنیا بھر کے لوگوں کو پولسی شریعت (Pauline Doctrine) کے مطابق عیسائی بنائیں گے۔یہودی اس معاملے میں بالکل الگ تھلگ کھڑے نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو سرے سے مسیح مانتے ہی نہیں۔وہ عہد قدیم سے ''موعود'' اپنے اسرائیلی مسیح کا انتظار کر رہے ہیں، جسے مسلمان دجال کے نام

سے جانتے ہیں۔

پیچھے گزرنے والی طویل بحث کا مقصد حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کے واقعہ کی حقانیت کو منطقی بنیادوں پر ثابت کرنا اور اُن کے نزول کے وقت کا تعیّن کرنا تھا۔ گفتگو تمام پہلوؤں سے ہوتی ہوئی جس نہج پر پہنچی ہے، وہاں وقت کا تعیّن مشکل نہیں رہا۔ تمام احادیث، قرآن اور عہد نامہ جدید (New Testament) کے بیانات کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بہت جلد دنیا میں واپس تشریف لانے والے ہیں اور اُن کا نزول زمانۂ جدید کے تین سال بعد ختم ہونے والے عہد کے آخر میں ہو گا۔ وہ تلواروں اور گھوڑوں کی بجائے مشین گنوں، ٹینکوں، طیاروں اور میزائلوں کی مدد سے جنگ لڑیں گے۔ اگر 21 دسمبر 2012ء کو دنیا قیامت جیسے ''حادثۂ ساعت'' سے بچ جاتی ہے تو پھر عین ممکن ہے کہ یہ دن حضرت عیسیٰؑ کی واپسی کا ہی دن ہو۔ اُس وقت عالم یہ ہوگا کہ کفر و اسلام کی فوجیں جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک دوسرے سے مقابلہ کیلئے مورچہ زن ہوں گی۔

21 دسمبر 2012ء کی تاریخ کے حوالے سے ایک مکتبۂ فکر کا کہنا ہے کہ یہ ''عالمگیر بیداریٔ شعور'' کا دن ہوگا۔ اِس تصور کو انگریزی میں Universal Awakening of Consciousness کہتے ہیں۔ دینیاتی کسوٹی پر پرکھ کر ہم اِس تصور کی تشریح ایسے کر سکتے ہیں کہ یہ دن دنیا بھر میں بیداریٔ ایمان اور خدا کی طرف واپسی کا دن ہوگا۔ تاہم یہ بیداری لازماً کسی عالمگیر حادثہ کا نتیجہ ہوگی اور اگر یہ حادثہ قدرتی یا فلکی آفت کی صورت میں نہ ہوا، تو قرینِ قیاس ہے کہ یہ عالمگیر جنگ و جدل اور حضرت عیسیٰؑ کی دنیا میں واپسی کی صورت میں ہو۔

یاجوج ماجوج اور دجال

Gog Magog and Antichrist

قربِ قیامت اور حضرت عیسیٰؑ کے موضوعات سے منسلک دو اور موضوعات کی یہاں پر وضاحت بے حد ضروری ہوگی۔ یہ دو معروف موضوعات ہیں،(الف) قومِ جوج ماجوج (قرآن میں : یاجوج و ماجوج) اور (ب) فتنۂ دجال۔ پہلے ہم قومِ جوج ماجوج پر علمی نگاہ دوڑا کر اِس کی تاریخی وجغرافیائی اعتبار سے صحیح ترین تشریح کرنے کی کوشش کریں گے،اوراس کے بعد دجال کے فتنہ کو زیرِ بحث لائیں گے۔''جوج ماجوج'' بنیادی طور پر عبرانی زبان(Hebrew) کا مرکب ہے۔عبرانی میں اس کی اصل ادائیگی''گوگ ماگوگ''اور انگریزی میں "Gog Magog" ہے۔عبرانی زبان عربی کی پیشرو اور سامی زبان ہونے کے ناطے عربی کی''بہن زبان''(Sister Language) ہے۔مشترک سامی ماخذ سے اخذ کیے جانے کے

باعث عربی اور عبرانی کے بہت سے حروف اور آوازیں مشترک ہیں۔ تاہم عربی ''ج'' (جمل) کو عبرانی میں ''گیمل'' کہا جاتا ہے، یعنی اُردو ''گ'' کی آواز پر ادا کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے دور سے پہلے کے یہودی موجودہ چین (درحقیقت ''چینی ترکستان'') سے لے کر وسطی روس تک کے علاقے کو ''ماگوگ'' یا ''ماگوگ کا خطہ'' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ موجودہ انگریزی بائبل میں اس خطے کو Magog کہا گیا ہے۔ جبکہ بائبل ہی قدیم تاریخی معلومات پر مبنی ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم تک یہ معلومات پہنچاتی ہے کہ ''ماگوگ'' (Magog) حضرت نوحؑ کے تیسرے بیٹے ''یافث'' (Japheth) کے سات بیٹوں میں سے دوسرا تھا۔[1] اسی طرح بائبل میں موجود ''کتابِ حزقیل'' کے سمجھنا نے بھی اِس خطہ کو یافث کے دوسرے بیٹے سے منصوب کر کے اُس کی ملکیت جگہ یعنی "The Land of Magog" کا نام دیا تھا۔ اسی طرح قدیم مشرق وسطیٰ سے دستیاب دیگر معلومات سے پتا چلتا ہے کہ ماگوگ ایک مالدار اور مؤثر آدمی تھا، جو مذکورہ بالا خطہ میں آباد ہوا اور یہیں اُس کی نسل پھلی پھولی۔ اسی نسبت سے یہ علاقہ عربی میں ''ماجوج'' اور عبرانی میں ''ماگوگ'' کہلایا۔ یونانیوں نے اپنی تہذیب کے دورِ عروج میں اِس خطہ کو ''ماگوگیہ'' (Magogia) کے نام سے موسوم کیا۔ ماگوگ کی نسل کے آگے چلنے اور قبیلوں کی صورت میں پھیلاؤ کے بعد یہ لوگ اجتماعی طور پر ''گوگ قوم'' کہلائے۔ بعدازاں اپنی بربریت کے باعث یہ لوگ دوسری قوموں میں ''گوگ ماگوگ''، یعنی ''ملکِ ماگوگ کی باسی گوگ قوم'' کے نام سے مقبول ہوئے۔ اِس واقعہ سے ملتی جلتی کئی ایک مثالیں اسلامی تاریخ سے بھی دی جاسکتی ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کا بانی ''عثمان علی'' اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست ہی قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا جس کا کوئی باقاعدہ نام بھی نہ تھا، لیکن آلِ عثمان نے اپنے جدّ امجد کے نام پر اِس وسیع و عریض سلطنت کو ''امارتِ عثمان'' ہی کہنا پسند کیا، جبکہ وہ خود ''عثمانی'' کہلوائے۔ بعینہٖ اسی طرح ''قریشِ مکہ'' بھی مختلف قبائل میں منقسم ہونے کے باوجود اجتماعی طور پر ''قریش'' ہی نام سے عرب بھر میں مشہور تھے، جبکہ ''قریش''، حضور ﷺ سے اوپر بارہویں پشت میں گزرنے والے بزرگ ''فہر'' کا لقب تھا۔

قرآن پاک سے دستیاب معلومات کے مطابق جنابِ ذوالقرنین[1] دو پہاڑیوں کے درمیان

1۔ بائبل، کتابِ پیدائش: باب 10۔ مزید برآں کتابِ حزقیل میں اس جگہ کو ''ماگوگ کا خطہ'' (Land of Magog) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ (باب 38:1-2)

ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جو یاجوج ماجوج کے ہاتھوں بہت تنگ تھی۔ یہ قرآن میں بیان کردہ اُن کا تیسرا سفر تھا، جو کہ اُن کی اپنی سلطنت سے شمال کی جانب کیا گیا تھا۔ سورۂ کہف کے مطابق جنابِ ذوالقرنین نے اُن لوگوں کی درخواست پر جو حفاظتی دیوار تعمیر کروائی اُس میں لوہے کے بڑے بڑے دروازے بھی تھے۔ اِس دیوار کا مقصد یاجوج ماجوج کی لوٹ کھسوٹ سے مقامی لوگوں کو بچانا تھا۔ آج بھی یہ دیوار کوہِ قاف ،چیچنیا، میں کھڑی ہے اور اسے یونانی مؤرخین نے ''سدِ سکندری'' کا نام دیا تھا۔ یہ تقریباً 48 میل لمبی ہے اور اِس میں لوہے کے بڑے بڑے دروازے قرآن کے بیان کے عین مطابق استعمال کیے گئے ہیں۔ اِس دیوار کی سمت واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ یہ شمال مشرق سے آنے والے حملہ آوروں سے بچنے کیلئے تعمیر کی گئی۔ یہ حملہ آور کون ہو سکتے تھے؟ کیا وہ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟ بخاری شریف کی ایک حدیث کے مطابق یاجوج ماجوج نسلِ انسانی میں سے ہیں (یعنی انسان ہیں) اور اُن کی تعداد (یعنی آبادی) بہت زیادہ ہے اور اللہ اُنہی سے جہنم کو زیادہ بھرے گا۔[2]

اِن تمام قرائن کی روشنی میں یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہ جاتی کہ قرآن کریم میں مذکور قومِ یاجوج ماجوج سے مراد ''اہلِ چین'' ہیں، جو زمانہ قدیم سے اِس طرح اپنے علاقہ میں مقید ہیں جیسے انہیں باقی دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں چین و منگولیا کے باشندے ہمیشہ سے اپنے پڑوس میں بسنے والی دیگر اقوام پر ظلم کرتے آئے ہیں۔ اِس پورے خطے میں آباد لوگوں کو انتھروپالوجی کی زبان میں Mongolides کہتے ہیں، جس کی اُردو شکل ''منگول'' ہے۔ یہی لوگ حضرت نوحؑ کے تیسرے بیٹے ''یافث'' کی اولاد سے ہیں۔ چنگیز خان، ہلاکو خان اور امیر تیمور جیسے ظالم شہنشاہان بھی اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ عصر حاضر کے معروف پاکستانی عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد بھی یہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ چینی ترکستان کے وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے چپٹے ناکوں اور چھوٹی آنکھوں والے لوگ ہی یاجوج ماجوج ہیں۔[1]

1۔ ذوالقرنین کی تاریخی حیثیت پر مزید تفصیلات کے لیے مطالعہ کیجیے:
Hayder, Sayyed Waqas, What Quran Says: A Modern Reconstruction, Lahore, 2009, pp. 200-205
2۔ (الف) صحیح بخاری۔ تفسیر سورہ حج، (ب) صحیح مسلم۔ کتاب الایمان

موجودہ دور کے سیاسی حالات کو دیکھا جائے تو عالمی سطح پر چین کو امریکہ کے بعد دوسری سپر پاور

مانا جاتا ہے۔سوویت یونین کے انہدام کے بعد دنیا کی نظریں عالمی طاقت کے توازن کیلئے جس ملک پر ہیں، وہ چین ہی ہے۔حالیہ خبروں میں ہے کہ چین 2012ء کے آخر تک اپنے سپر پاور ہونے کے باقاعدہ اعلان کا ارادہ رکھتا ہے۔جبکہ امریکہ اِس کے برعکس چین کو نکیل ڈالنے کیلئے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہا ہے، تاکہ حالات اُس کے قابو میں رہیں۔یوں لگتا ہے کہ عالمی سیاست کی یہ گرما گرمی جنگ وجدل کے آتش فشاں کو پھٹنے پر مجبور کر ہی دے گی اور عالمی حالات آنے والے دو یا تین سالوں میں سو فیصدی ویسے ہو جائیں گے، جن کی پیشگوئی احادیث میں کی جا چکی ہے۔"ہرمجدون" (Armageddon) سے فارغ ہو کر حضرت عیسیٰؑ کی یاجوج ماجوج سے جنگ کی پیشگوئی سے مراد یہی لگتا ہے کہ یہ تن اہل مغرب (Christian Europe) سے لڑ چکنے اور اُن پر غالب آنے کے بعد اہل چین سے بھی معرکہ آرائی کریں گے اور یہ چین کا بحیثیت سپر پاور خاتمہ ہوگا۔یہ وہ وقت ہوگا جب اسلام ایک بار پھر تہذیبی صورت اختیار کر لے گا اور اسلامی تہذیب دنیا بھر میں پھیل جائے گی۔

اب تھوڑی سی بات فتنۂ دجال کے حوالے سے بھی کر لی جائے۔"دجال" عربی زبان کا لفظ ہے اور اِس کا مطلب ہے "جھوٹا"۔انگریزی میں اس کو Antichrist کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔جس سے مراد "حضرت مسیحؑ کا بدترین دشمن" ہے۔عیسائیوں کے عہد نامہ جدید میں بھی دجال کو Antichrist کے نام سے ہی پکارا گیا ہے اور عیسائی صدیوں سے اُس کا انتظار کرتے اور اُس کے فتنہ کی مختلف تشریحات کرتے آ رہے ہیں۔احادیث نبویؐ میں بھی دجال کا جو پورا نام استعمال کیا گیا ہے وہ "مسیح دجال" ہے۔جس کے معنی ہیں "جھوٹا مسیح"۔عربی زبان میں یہ مرکب نام سریانی زبان سے مستعار لیا گیا ہے اور قرآن کریم کے نزول سے کم و بیش 400 سال پہلے تیسری صدی ہی میں یہ عربی روزمرہ میں متعارف ہو چکا تھا۔"**المسیح الدجال**" کا سریانی ماخذ "مشیحا دگالا" (Mashiha Daggaala) ہے اور اس کا مطلب بھی بالکل وہی ہے جو عربی میں سمجھا جاتا ہے۔

دجال کی بطور شخصیت نشانیوں میں آیا ہے کہ وہ دائیں آنکھ سے کانا ہوگا، بہت بڑے گدھے پر سوار ہوگا، اُس کے ہاتھ میں تلوار ہوگی اور ماتھے پر "کفر" لکھا ہوگا۔اُس کی رفتار بہت تیز ہوگی اور وہ قدرت

1۔بحوالہ ڈاکٹر شاہد مسعود، The Hidden Truth: End of Times، (دستاویزی پروگرام) پیشکش: اے آر وائے ٹی وی (ARY TV)

وکبریائی کا دعویٰ کرے گا۔ مزید برآں وہ اپنے دعووں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوگا جس سے لوگ اُسے سچا مان کر اُس کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ مضبوط ایمان کے دعویدار بیتے نوں کی ایک اکثریت بھی انہی شعبدوں کو دیکھ کر دجال کو معبود تسلیم کر لے گی اور خدا و رسول ﷺ پر ایمان سے مرتد ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ لوگ ملحد ہو جائیں گے اور ان دیکھے خدا کا مکمل انکار کر دیں گے۔ جب دجال اپنی انتہائی مضبوط جمعیت قائم کر چکے گا تو باقی ماندہ اہل ایمان سے اُس کی باقاعدہ جنگ ہوگی۔ اِس میں ابتدائی کامیابیاں دجالی کیمپ کو ہی حاصل ہوں گی۔ تاہم حضرت عیسیٰؑ کے نزول اور اُن کی طرف سے افواجِ اسلام کی سپہ سالاری سنبھال لینے کے بعد بیتے نوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور وہ کفار پر تابڑتوڑ حملے کریں گے۔ جنگ کے آخر میں لشکرِ اسلام کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ آخری معرکہ سرزمینِ شام پر ہوگا اور دجال شکست کے بعد بھاگ کھڑا ہوگا۔ دجال کے اس بزدلانہ فرار کے حوالے سے احادیث میں ایک جگہ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ جگہ موجودہ اسرائیل میں ہے اور اس کو ''بابِ لُدّ'' کہتے ہیں[1]۔ دجال یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوگا کہ قتل کر دیا جائیگا[2]۔ دجال کے قتل کے بعد نہ صرف دجال کا فوجی کیمپ جو کہ یہودی اکثریت پر مشتمل ہوگا شکستِ فاش سے دوچار ہوگا، بلکہ دجال کے فتنے کا عفریت بھی اپنے حتمی انجام کو پہنچ جائے گا۔

مذکورہ بالا تمام معلومات احادیثِ نبویؐ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اِن معلومات کی روشنی میں دجال کے بارے میں چند پہلو بڑے واضح انداز میں سامنے آجاتے ہیں۔ جیسا کہ دجال ایک جیتا جاگتا انسان ہو گا، بہت سی قوتیں اُس کے ہاتھ میں ہوں گی، وہ اپنے حامیوں کے ہمراہ اہل ایمان سے جنگ کرے گا اور بالآخر حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو جائیگا۔ تاہم احادیث میں دجال کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک اضافی چیز یعنی فتنۂ دجال کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اور جس چیز سے پناہ مانگنے کا حکم رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دیا گیا ہے، وہ از خود دجال بحیثیتِ انسان نہیں، بلکہ وہ فتنہ ہے جس کے اندر دجال نمودار ہو گا۔ اسلامی تاریخ میں اکثر علماء دجال کے موضوع کو دو عنوانات کے تحت زیرِ بحث لاتے رہے ہیں۔ اوّل

1۔ آج کل اس جگہ کو ''لڈا'' (Lydda) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس مقام پر اسرائیلی حکومت نے ایک بہت بڑا بین الاقوامی ہوائی اڈا قائم کر رکھا ہے۔ ہوائی اڈے کے قیام سے ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ حدیثِ نبویؐ میں اس مخصوص جگہ سے دجال کے فرار کی بات کیوں کی گئی ہے۔
2۔ ابن ماجہ، ابوداؤ، ترمذی، درّ منثور، حاکم، کنز العمال۔

''دجال بحیثیتِ شخصیت''[1]، دوّم ''دجال بحیثیتِ فتنہ''۔ حدیث میں وارد الفاظ ''فتنۂ دجال'' کی شرح اکثر علماء کے ہاں ''جھوٹے یا سراب پر مبنی نظام'' کے طور پر کی جاتی رہی ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ دجال بطور شخصیت ضرور ظاہر ہوگا اور جھوٹ و سراب اور ظاہری نمود پر مبنی نظام کی کمان سنبھالے گا۔ لیکن اُس کی آمد سے پہلے سٹیج پوری طرح سے سج چکا ہوگا۔ اگرچہ یہ تشریحات قرونِ وسطیٰ میں بھی کی جاتی رہی ہیں اور لوگ توقع کرتے رہے ہیں کہ دجال کا فتنہ قریب ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا کے اندر جو نظام اٹھارہویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کے بعد پروان چڑھا، وہ دجالی فتنہ کا موزوں ترین عکاس ہے۔ یہ نظام شروع سے آخر تک ظاہری نمود کا حامل ایک ایسا سراب ہے جس کے پیچھے انسان بھاگتا ہی چلا جاتا ہے۔ صنعت و حرفت کی آمد نے انسان کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ وقت میں سے برکت ختم ہو گئی ہے اور چوبیس گھنٹے کا دن بھی کم پڑ گیا ہے۔ ایک زرعی معاشرے کی اخلاقیات بھی زرعی ہوتی ہیں۔ جبکہ صنعتی معاشرے کے اندر اخلاقیات یکسر بدل جاتی ہیں۔ یا پھر ہم دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات تقریباً ناپید ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ صنعتی معاشرے میں ہر چیز کی قدر کھپت، پیداوار، کاروبار اور بالآخر منافع کی بنیادوں پر پرکھی جاتی ہے۔ یہ درحقیقت زرعی معاشرے ہی کا فیضان تھا کہ اِس میں شریعت کا نظام ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک قابل عمل رہا۔ تاہم صنعتی انقلاب کے بعد جو عالمگیر معاشرہ وجود میں آیا ہے، وہ سودی نظام پر کھڑا ہے۔ بینکاری نظام صنعتی معاشرہ کا جزو لاینفک ہے اور اس کے اندر انسان کی اہمیت محض خدمات یا سرمائے کی بنیاد پر ہے۔ انسان کی ذاتی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے، جبکہ فلسفۂ اخلاقیات بھی کاروباری منڈی جیسی آج کی دنیا میں کہیں مؤثر نظر نہیں آتا۔ خالص سرمائے سے خالص سرمایہ حاصل کرنے اور امیر سے امیر تر ہونے کا فلسفہ رائج الوقت ''سرمایہ دارانہ نظام'' (Capitalism) کے پیچھے کارفرما ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی معتبر نظام کبھی پیش کیا گیا تو وہ کارل مارکس کا انسانی برابری پر مبنی ''مارکسزم'' (Marxism) کا فلسفہ تھا، جس کو اُس نے اپنی معروف کتاب "Das Kapital" میں پیش کیا۔ مارکسزم نے بعد میں ولادی میر لینن کے معاشی فلسفہ کے اثرات قبول کرتے ہوئے ''اشتراکیت'' (Communism) کی شکل اختیار کر لی۔ یہ نظام بھی اپنی چند خوبیوں کے

1۔ یہاں دجال سے مراد ''المسیح الدجال'' کی شخصیت ہے۔ جس کا تذکرہ احادیث میں بھی بطور شخصیت ہی کیا گیا ہے۔

باوجود ایک ایسا گمراہ کن نظام ٹھہرا، جو اپنے اندر الحادیت اور انکار مذہب کے شدید جراثیم رکھتا تھا۔ اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے درمیان عالمی معاشی اُفق پر کافی عرصہ تک محاذ آرائی رہی۔اس عہد کو ''سرد جنگ''(Cold War) کا نام دیا جاتا ہے۔سرد جنگ میں اشتراکیت کی نمائندگی روس اور سرمایہ دارانہ نظام کی نمائندگی امریکہ کر رہا تھا۔اس دور میں دنیا حقیقی معنوں میں دو سیاسی و معاشی گروہوں میں منقسم (Bipolar) رہی۔نصف صدی تک جاری رہنے والے مقابلہ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام نے اشتراکیت کو عملی طور پر پچھاڑ ڈالا اور یوں 1989ء سے دنیا ہر اعتبار سے Unipolar ہے، یعنی ایک ہی نظامیاتی ستون پر کھڑی ہے۔اس کی تعریف اہل دانش یوں بھی کر سکتے ہیں کہ دنیا 1989ء سے ''ایک ہی آنکھ'' رکھتی ہے اور اس کی دوسری آنکھ بند ہو چکی ہے۔میڈیا کی انتہائی ترقی سے لے کر گلی میں پھیری لگانے والے تک ہر کوئی اسی نظام کا حصہ ہے۔ ہر کوئی اپنی جائز و ناجائز مصنوعات کو پروپیگنڈہ کے ذریعے بیچ رہا ہے۔آج چاہے دنیا کا امیر ترین آدمی بل گیٹس ہو یا کوئی زید بکر، ہر کوئی پیسہ سے پیسہ کمانے کی فکر میں ہے۔ جبکہ اس عملِ منافع خوری میں سود اور کاروباری منافع کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہا۔سود در سود کے دلدل جیسے نظام میں ہر کوئی یقین کرنے لگ پڑا ہے کہ سود درحقیقت جائز منافع ہی ہے۔آج یہ نظام چھ ارب سے زائد انسانوں کا پیٹ پال رہا ہے۔سرمایہ دارانہ نظام میں بینک اور سٹاک مارکیٹ جیسے ادارے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی بقاء کا سارا دارومدار سود پر ہے۔آسان ترین تشریح میں ہم موجودہ نظام کو کفریہ نظام کہہ سکتے ہیں اور یہی وہ 'کفر' ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کانے دجال کے ماتھے پر کندہ ہے۔

اگر فحاشی کو فتنۂ دجال کا ایک اہم پہلو تصور کر کے اس کے عالمگیر سطح پر پھیلاؤ کا جائزہ لیا جائے تو بھی معاملہ بہت ٹیڑھا نظر آتا ہے۔سیٹلائیٹ چینلز، کیبل نیٹ ورک اور انٹرنیٹ فحاشی و عریانی کے آسان اور ارزاں ترین ذرائع ہیں، جنہوں نے دنیا کو مکڑی کے جالے کی مانند ہر طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔آج اگر کوئی اِن سے بچنا بھی چاہے تو بچ نہیں پاتا۔عورت کی شخصیت کو اُس کی زینت یعنی پردہ سے محروم کر کے اُس کو 'ماڈل' کا لقب دے دیا گیا ہے اور آج کی عورت ''چراغِ خانہ'' کی بجائے ''شمعِ محفل'' بننے میں زیادہ سکون محسوس کرتی ہے۔المختصر اخلاقی لحاظ سے بھی ''اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔'' جدید مادی تہذیب نے عورت کو بے لباس کر کے ایک جدید ''روشن خیال'' مقام عطا کیا ہے، جس کی وجہ سے صنفِ

نازک کو ''چکھتے ر'' کی بجائے ''ننگ بدن'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔مختصر ترین لباس میں ملبوس خواتین ٹی وی چینلز پر نمودار ہو کر اسلام کی من چاہی تشریحات کر رہی ہوتی ہیں۔اُن کا سارا زور اسلام کو روشن خیال اور مادر پدر آزاد مذہب ثابت کرنے پر لگ رہا ہوتا ہے اور اس کارہائے عظیم کی انجام دہی میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔اس پر مستزاد یہ کہ اگر کوئی بات قرآن وسنت کے مطابق بیان کر دی جائے تو سرابِ مغربیت کی سحر زدہ ''حوا کی بیٹیاں'' ایسی تمام باتوں کو دقیانوسیت کا فتویٰ عطا کر کے ناقابل عمل قرار دے دیتی ہیں۔

یہی وہ فتنہ ہے جس نے ہر طرف سے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے اور جسے فتنۂ عظیم قرار دے کر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس سے بچنے کی دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔بے شک ہم اس کے سامنے بے بس ہیں اور چاہنے کے باوجود بھی اس کے حصار سے نکل کر نہیں بھاگ سکتے۔زمین کے گرد لپٹا ہوا یہ جالا اتنا وقفہ بھی نہیں دیتا کہ اس میں سے کوئی نکل بھاگے۔

موجودہ صنعتی تہذیب نے جس نظام تعلیم کو جنم دیا اور پروان چڑھایا ہے، وہ بھی خالصتاً ''فائدہ'' کے تصور پر مبنی ہے۔پروفیشنل ایجوکیشن کا مطلب ہی ایسے ہنر سیکھنا ہے، جو پیسہ کمانے میں سب سے زیادہ مؤثر ہوں۔ہنر سیکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔لیکن دورِ جدید میں ایسے ہنر متعارف کروائے گئے ہیں، جن میں سے اکثریت کا تعلق کاروباری غلط بیانی سے ہے۔مارکیٹنگ میں حاصل کی جانے والی ڈگریاں درحقیقت جھوٹ پیشہ وارانہ انداز میں بولنے کی مہارت پر سند ہیں۔صحافتی تعلیم میں پروپیگنڈا کا سارا تصور ہی جھوٹ کو سچ بنانے اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کے گرد گھومتا ہے۔

آج صحافتی تعلیم و تربیت کے زیر اثر جھوٹ کو ایک کارآمد حربہ سمجھ کر اتنا پھیلایا جا رہا ہے کہ عقل پروپیگنڈا کے مقاصد اور نتائج پر دنگ رہ جاتی ہے۔المختصر جھوٹ کے زیر اثر رہ رہ کر سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق دورِ جدید کے انسان کیلئے تقریباً ختم ہو چکا ہے۔جس طرح برائی بہت زیادہ پھیلنے پر برائی نہیں لگتی، بالکل اُسی طرح جھوٹ بہت عام ہو جانے پر جھوٹ نہیں لگتا۔مزید برآں تمام سائنسی مضامین ''ارتقاءِ زندگی''(Evolutionism) اور ''آفاقی حادثہ'' (Chance/Incidence) جیسے لادین فلسفوں پر کھڑے ہیں۔دراصل انہی جھوٹ کے پلندوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں پر ڈاکٹریٹ تک کی ہزاروں ڈگریاں تقسیم کی جاتی ہیں۔جبکہ تصور خدا اور ضرورتِ مذہب سے انکار پر یونیورسٹیاں ہر

سال سینکڑوں سیمینارزاور لیکچرز کا اہتمام کرتی ہیں۔ آج کا انسان رسمی تعلیم حاصل کیے بنا کچھ بھی نہیں اور رسمی تعلیم کے حصول کیلئے اُسے اِن خرافات کا حصہ لازماً بننا پڑتا ہے۔

بات کو سمیٹتے ہوئے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ تہذیبِ حاضرہ کا ہر پہلو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ وہ فتنۂ دجال کا حصہ ہے اور یہ کہ فتنۂ دجال آج اپنے پورے جوبن پر ہے۔ سٹیج پوری طرح لگ چکا ہے اور اب کسی بھی لمحے مسیح دجال کا بطور شخصیت ظہور ہوسکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس سپہ سالارِ کفر کا ظہور 2012 تک ہو جائے۔ حالات جس رُخ چل نکلے ہیں، اس سے نشاندہی ہو رہی ہے کہ دجال کی شخصیت دو تین سالوں میں منظر عام پر آ جائے گی۔ یہود و نصاریٰ کا گٹھ جوڑ، اہلِ مغرب کا اسلام اور مسلمانوں سے تحقیر آمیز رویہ، عالمی اُفق پر نمودار ہونے والی جنگیں، نامعلوم دشمن کے خلاف لڑی جانیوالی موجودہ عالمی جنگ، قتل و غارت گری اور عالمگیر بدامنی، سبھی کسی بہت بڑی تبدیلی کا عندیہ دے رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حالات کے صحیح رُخ کا ادراک کر کے بروقت عالمِ کفر کے مقابلہ کیلئے تیار ہو جائیں۔ اگر بروقت تیاری نہ کی گئی اور مصلحتیں ہی آڑے آتی رہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم شکوک و شبہات کا ہی شکار ہو کر رہ جائیں اور اللہ تعالیٰ ہم سے آخری موقع بھی چھین لے۔

BIBLIOGRAPHY

انگریزی کتب

1. Armstrong, Karen, *A History of God,* New York: Ballantine Books, 2002

2. Asimove, Isaac, *Asimove's Guide to Science,* New York: Basic Books, 1972

3. Hayder, Sayyed Waqas, *What Quran Says: A Modern Reconstruction,* Lahore, EuroAsia Research Foundation, 2009

4. Milbrath, Susan, *Star Gods of the Maya,* University of Texas Press, 2000

5. Rabolu, V.M., *Hercolubus or Red Planet*, Spain: Burgos, 2004

6. Sitchin, Zecharia, *The 12th Planet,* Harper Press, 1976

7. Wolfram von Soden, *"Zeitschrift fur Assyriologie"*, No. 47, Frankfort

8. Dowson, John, *A Classical Dictionary of Hindu Mythology and Religion,* New Delhi, 2004

9. Fukuyama, Franics, *The End of History and the Last Man,* New York: The Free Press, 1992

اُردو کتب

10۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم، کائنات اور اس کا انجام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں، لاہور (فیروزسنز لمیٹڈ) 2004،

11۔ مولانا محمد عبد الرحمان مظاہری، قیامت کا دن قرآن وسنت کی روشنی میں، لاہور (ادارہ اسلامیات)، 2003

12۔ مولانا عبد المصطفٰی اعظمی، جہنم کے خطرات مع قیامت کب آئیگی؟، کراچی (مکتبۃ المدینہ)، 2000

13۔ مفتی محمد رفیع عثمانی، علاماتِ قیام اور نزولِ مسیحؑ، کراچی (مکتبہ دار العلوم)، 2008

14۔ مولانا عاشق الٰہی بلند شہری، علاماتِ قیامت، لاہور (الوقار پبلیکیشنز)، 2009

15۔ مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی، علاماتِ قیامت، دہلی (دہلی پرنٹنگ ورکس)، 1921

16۔ ہارون یحییٰ، اینڈ آف ٹائم، (مترجم: انجم سلطان شہباز)، جہلم (جہلم بک کارنر)، 2009

بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن

(BAB-UL-ILM RESEARCH FOUNDATION)

ایک تعارف

''بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن''(BIRF) بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے تحقیقی ادارے ''یوروایشیا ریسرچ فاؤنڈیشن''(EuroAsia Research Foundation) کا پاکستان میں ذیلی وِنگ ہے۔ BIRF کا قیام مارچ 2009ء میں عمل میں لایا گیا۔اس سے پہلے یورو ایشیا ریسرچ فاؤنڈیشن(ERF) کے زیراہتمام اُبھرتے ہوئے نوجوان سکالر''سید وقاص حیدر'' کی شہرہ آفاق کتاب **"What Quran Says: A Modern Reconstruction"** شائع ہوکر علمی حلقوں سے داد تحسین وصول کر چکی ہے۔تاہم یوروایشیا ریسرچ فاؤنڈیشن (انٹرنیشنل)اب پاکستان میں''بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن'' کے نام سے تحقیق وتخریج اورتصنیف وتالیف کے امور سرانجام دے رہی ہے۔ لہٰذا آئندہ یوروایشیا ریسرچ فاؤنڈیشن کی تمام تصنیفات پاکستان میں بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن(BIRF) کے پلیٹ فارم سے ہی شائع ہوں گی۔یاد رہے کہ کتاب ہٰذا جوکہ آپ کے ہاتھوں میں ہے BIRF کے بینر تلے چھپنے والی پہلی تصنیف ہے۔

یورو ایشیا ریسرچ فاؤنڈیشن (ERF) کا نیٹ ورک بیک وقت برطانیہ، جرمنی، سپین، اٹلی، فرانس،کوسووااور پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔جبکہ ERF کا ہیڈ آفس مانچسٹر برطانیہ میں ہے۔ان تمام ممالک میں یوروایشیا ریسرچ فاؤنڈیشن (ERF) کے معزز سکالرز متفرق موضوعات پر تحقیق وتدوین کی ذمہ داری سے عہدہ براء ہوتے ہوئے اسلام کے دوسرے فکری انقلاب کے لیے اساس فراہم کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

ہمارانصب العین

دورِجدید میں صحیح اسلامی فکر کا احیاء،قرآنی تعلیمات کی آسان وجامع تشریح اوراسلام کی حقیقی روح کا عالمگیر تعارف ہمارے نصب العین میں شامل ہے۔بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن(BIRF) بیک وقت قرآنیات، علوم حدیث،علوم فقہ،تقابل ادیان،ختم نبوتؐ اور مستقبل میں اسلام کودرپیش چیلنجوں کے حل کے موضوعات پر تحقیق،تخریج،تدوین اورتصنیف وتالیف کا کام اُردواورانگریزی دونوں زبانوں میں سرانجام دے رہی ہے۔بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن(BIRF) اپنے تجدیدی کام کے ذریعے اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ اُمتِ مسلمہ کی''علمی نشاۃِ ثانیہ''(Intellectual Renaissance) کے ظہور کا خواب جلد از

جلد شرمندۂ تعبیر ہو، تا کہ ایک بار پھر اسلام بحیثیتِ ''نظام'' اور ''تہذیب'' اقوام عالم کو فکری، روحانی، معاشی اور معاشرتی رہنمائی فراہم کر سکے۔ اسلام اپنے وہ تمام خصوصیات رکھتا ہے، جو کسی بھی جامع ترین عالمگیر معاشرتی نظام اور آفاقی تہذیب کے اندر ہونی چاہئیں۔ ہمیں یقین ہے، کہ ہمارا اس عظیم کام میں حصہ قابلِ قدر ہوگا اور اُمتِ مسلمہ کے فکری عروج اور دینی احیاء کی یہ تحریک ضرور کامیاب ہوگی۔ آیئے آپ بھی اس عظیم فکری اور تحقیقی تحریک میں ہمارا ساتھ دیں۔

معزز قارئین سے التماس ہے کہ وہ بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن (BIRF) کی تحقیقی خدمات کے حوالے سے اپنی مفید آراء اور مشوروں سے ضرور نوازیں۔ ہم آپ کی ہر تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔

بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

پاکستان

Email: birf.pakistan@hotmail.com

Phone: +92-333-7748209, 0322-778-7338

بابُ العلم ریسرچ فاؤنڈیشن کی کتب

مطبوعہ کتب

English

1. WHAT QURAN SAYS: A MODERN RECONSTRUCTION

از سید محمد وقاص

2. A STUDENT INTRODUCTION TO GRAMMAR

از سید محمد وقاص

اُردو

3۔21 دسمبر 2012ء: دُنیا قیامت کے دہانے پر

مصنف صاحبزادہ محمد عبدالرشید

غیر مطبوعہ کتب

English

4. A CRITICAL LOOK INTO THE LIFE OF MUHAMMAD

by **Syed Muhammad Waqas**

5. ISLAM AND CHRISTIANITY: EXPLORATION OF FACTS

by **Syed Muhammad Waqas**

6. THE GRAMMAR VALLEY

by **Syed Muhammad Waqas**

7. ORIENTAL INDENTITY: A JOURNEY THROUGH OUR PAST

by **Syed Muhammad Waqas**

8. A STUDY OF THE LIVES OF JESUS AND MUHAMMAD

by **Syed Muhammad Waqas**

9. LET BIBLE SPEAK

by **Syed Muhammad Waqas**

اُردو

10۔قرآن وحدیث کا موضوعاتی جائزہ

مصنف حافظ صفدر مجید قادری

11۔کلیاتِ منظور واصبؔ

شاعر منظور احمد واصبؔ

12۔بیاضِ دل

شاعر محمد حسین ندیمؔ